

عہاسی صاحب کسی سے فون پر مصروف گفتگو تھے۔ چند لمحوں بعد ریسور رکھ کر ان کی جانب متوجہ ہوئے۔  
”سر! یہ لڑکی جس کے سلسلے میں، میں نے آپ سے بات کی تھی۔“ فاروقی صاحب اسے بھی بیٹھا  
اشارہ کرتے ہوئے کرسی پر بٹک گئے۔

”ہوں۔“ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ ”کیا نام ہے آپ کا؟“  
”نیلیم علی۔“

”فائل لائی ہیں آپ؟“

”جی۔“ اس نے اپنی فائل ان کی جانب بڑھادی۔

”پہلے کبھی لیڈی آپریٹر کی جاب کی ہے؟“ ان کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

”میں نے کبھی جاب نہیں کی سر!“ اس نے سر جھکا لیا۔ ”کسی بھی قسم کی۔“

”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے دیکھے بغیر فائل واپس کر دی۔

”میں آپ کو اپائنٹ کر لیتا ہوں۔ فاروقی صاحب آپ کو مس نگہت سے ملوادیں گے۔ وہ آپ کا  
سارا کام سمجھادیں گی۔ کل سے آپ آجائیں۔“

”تھینک یوسر!“

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کا کام اس قدر آسانی ہو جائے گا۔ اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

”تنخواہ آپ کی ساڑھے تین ہزار روپے ہوگی۔ یہ اشارٹ ہے۔ آپ کو منظور ہے؟“

”ٹھیک ہے سر!“ اس نے سر ہلایا۔

”پچھلے کئی دنوں کی مسلسل کوششوں کے بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے لیے یہ نوکری بھی نہیں

ہے۔ اس سے زیادہ کی توقع فضول تھی۔

وہ فاروقی صاحب کے ساتھ باہر آگئی۔ مس نگہت بھی آپریٹر تھیں اور کافی عرصے سے یہاں کام کر  
رہی تھیں۔ وہ اسے کام کی نوعیت سے آگاہ کرنے لگی۔

”ہیلو نگہت۔“ کسی نے ان کے شانے پر ہاتھ مارا تھا۔

نیلیم بھی نووارد کی جانب متوجہ ہوگئی۔

”اوہ! مس زارا۔ کیسی ہیں آپ؟“ مس نگہت مسکرائیں۔

”آئی ایم فائن۔“ اس نے نیلیم کو بغور دیکھا۔ ”نیا چہرا؟“

”یہ نیلیم ہیں۔ ان کو عہاسی صاحب نے آج ہی اپائنٹ کیا ہے۔“

”عہاسی صاحب نے۔“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ ناچنے لگی۔ ”ضرور کیا ہوگا۔ عہاسی صاحب کے

اپائنٹ کیے گئے اسٹاف میں ایک قدر ضرور مشترک ہوتی ہے۔ چہرا۔“

اس نے نیلیم کے رخسار پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

”زارا پلیز!“ نگہت کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

”او۔ کے۔ سی۔ یو!“ وہ مسکرائی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

”عجیب واہیات لڑکی ہے۔“ نیلیم نے اسے تنفر سے دیکھا۔ اس کا گال پر ہاتھ پھیرانے کی حرکت

اسے سخت بری لگی تھی۔

”کون ہیں یہ؟“ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔



”ہر دانش کے ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔ گھنٹے نے مختصر کیا اور اسے کام سمجھانے لگی۔  
نیلیم کا ذہن چند لمحوں کے لیے بھٹک گیا تھا۔ اس نے سر ہٹا کر اور کام سمجھنے لگی۔

”بجوا کل سے آپ فیکٹری جائیں گی؟“

ریشم دونوں ہتھیلیوں کے پیا لے میں چہرہ بھانے اسے کپڑے پر پس کرنا دیکھ رہی تھی۔  
”ہوں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”کر لیں گی بجو؟ میں نے سنا ہے لڑکیوں کے لیے باہر کا ماحول اچھا نہیں ہوتا۔“  
نیلیم نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

”انسان خود اچھا ہو تو سب اچھے ہوتے ہیں ریشم۔ اور پھر یہ میری مجبوری ہے، شوق نہیں، بیگ میں  
موجود رقم اب زیادہ عرصہ تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔“

”بجوا آپ کی تنخواہ تو اتنی کم ہے۔ اتنی تنخواہ میں ہمارا گھر نہیں چل سکتا ناں؟“  
نیلیم ہولے سے مسکرا دی۔

”اللہ مالک ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ کچھ عرصے میں کچھ شارٹ کورسز کر لوں پھر کہیں اور کوئی  
اچھی نوکری دیکھوں گی۔ کم از کم گھر میں فاقے تو نہیں ہوں گے ناں۔“

”اللہ میاں نے ہم سے وقار بھائی کو کیوں چھین لیا بجو؟“ وہ اداسی سے بولی۔ ”رلفی بھی ابھی کسی قابل  
نہیں ہے ورنہ کم از کم آپ کو تو یہ سب کچھ نہ کرنا پڑتا۔“

”خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ ایسے مت سوچا کرو۔“ وہ کپڑے دنگر میں  
لٹکانے لگی۔

”آپ کے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں بجو۔ آپ روزانہ اس پر اہلیم کا شکار ہوں گی کہ  
کیا پہنیں۔“

”وہ ہنس دی۔“

”بس جو کچھ بھی ہے۔ خدا کا شکر ہے۔“

”ویسے ایک بات ہے۔“ وہ اچانک چپکی۔ ”ان کپڑوں میں بھی آپ وہاں سب سے مختلف، سب  
سے اچھی لگیں گی۔ ہیں ناں؟“

”کیوں؟“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”کیونکہ آپ ہیں ہی سب سے اچھی۔“ اس نے پیار سے اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔

”اچھا! یہ کھن کیوں لگ رہا ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

اسی لمحے رلفی اندر آیا تھا۔

”بجوا کتنے پیسے ہوں گے آپ کے پاس؟“

”خیریت!“ اس نے ریشم کو خود سے علیحدہ کیا۔

”مجھے سخت ضرورت ہے۔ کچھ اہم نوٹس فوٹو اسٹیٹ کرانے ہیں۔ چند کتابیں خریدنی ہیں۔“

”کتنے پیسے چاہئیں؟“

”ہزار تو ہوں۔“ وہ بڑی جلدی میں تھا۔

”رلفی!“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”ابھی کچھ دن ہوئے تم ڈھائی ہزار لے کر گئے تھے۔“



وہ تو نہیں تھی بھو۔ اب میں خود تو نہیں کرتا ہوں۔ ضرورت ہے مانگ رہا ہوں۔ ورنہ کیا میں اس کے پرانے کوئیں سمجھتا ہوں؟ وہ اچانک ہی جھنجھلا گیا۔  
اس نے خاموشی سے اسے رقم لادی۔  
”کیا ہوا بھو؟“ ریشم نے اسے غور سے دیکھا۔ ”اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہیں؟“  
”کچھ نہیں۔“

وہ سر جھٹک کر کچن کی سمت چل دی۔ یہ رقم اس نے اماں کی دوائی کے لیے بچا بچا کر رکھی تھی اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اماں کی مہینہ بھر کی دوائیاں کہاں سے آئیں گی۔  
مریم کھانا تیار کر چکی تھی۔ چاول دم پر رکھے تھے اور سلاد کے لیے پیاز کاٹ رہی تھی۔  
”کھانا لگاؤں بھو؟“ اس نے بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔  
”نہیں۔ تم تھک گئی ہو گی۔ میں ریشم سے کہتی ہوں۔“  
”رہنے دیں بھو! اس کے امتحان سر پر ہیں۔ اچھا ہے کچھ پڑھ لے۔“  
”وہ پڑھ کہاں رہی ہے۔ ایسے ہی ادھر ادھر بھر رہی ہے۔“

سبز گھاس پر وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ گلابی نیل پالش سے سجے نرم پیروں پر نگاہ جمائے، دانٹوں سے لب کاٹے ہوئے گہری سوچ میں تھی۔

”امی تک میں نے تمہارا پیغام پہنچا دیا تھا۔“ مہناز کہہ رہی تھی۔ ”وہ جاننا چاہتی ہیں کہ عثمان میں آخر ایسی کیا برائی ہے جس کی وجہ سے تم شادی کے معاملے میں اس قدر متذبذب کا شکار ہو۔ عاصمہ چچی جلد از جلد یہ فریضہ نمٹا دینا چاہتی ہیں۔ آخر ان کے بیٹے کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ لوگ بار بار یہی ایک سوال کرتے ہیں کہ اس مقدس فریضے کے سر انجام دیے جانے میں اتنی دیر کیوں لگائی جا رہی ہے۔“  
وہ کچھ بھی کہے بنا بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

”الماس! میں تمہاری بہن ہوں۔ تمہاری عادتوں سے بخوبی واقف ہوں۔ تم بہت جلد ہر شے سے اکتا جاتی ہو۔ خواہ وہ کوئی لباس ہو، سینڈل ہو یا گانوں کی کیسٹ لیکن یہ معاملہ نہایت اہم ہے۔ تمہیں اپنے بچکانہ رویے میں تبدیلی کرنی ہو گی۔“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی۔

”اور پھر۔ یہ بھی ہے کہ کچھ دنوں سے تم۔“ وہ پھر خاموش ہوئی۔

”الماس نے سر کو اٹھا کر اسے دیکھا۔“ ہاں کہو! کیا بات ہے؟“

”کیا تمہیں کوئی اور شخص مل گیا ہے؟“ اس نے الماس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”تمہارے معمولات

بڑی حد تک تبدیل ہو گئے ہیں۔ تم گفتگوں کسی سے فون پر باتیں کرتی ہو اور کل صبا کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی، تم نے عرصے سے اس سے بات نہیں کی۔ سب جانتے ہیں کہ وہ تمہاری واحد دوست ہے۔ اگر تم اس سے باتیں نہیں کرتیں تو پھر وہ کون ہے جس سے تم روزانہ کئی کئی گھنٹے مخاطب رہتی ہو؟ پہلے تم کبھی ہفتوں میں گھر سے نکلا کرتی تھیں اور اب تمہیں ہر دوسرے روز گاڑی کی ضرورت پڑتی ہے۔ گھر میں سب کو علم ہے کہ تم اکثر عثمان سے ان کی گاڑی لے جاتی ہو۔ عثمان کی شرافت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ نہ تو انہوں نے بھی تم سے باز پرس کی اور نہ

گھر میں کسی سے ذکر کیا۔ لیکن شاید، وہ حماقت کر رہے ہیں۔“  
”وہ مجھ سے کسی بھی قسم کی باز پرس کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔“ وہ خفگی سے گویا ہوئی۔



”میں کس سے باتیں کرتی ہوں اور کہاں جاتی ہوں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں نہ وہ دخل انداز ہو سکتے ہیں نہ کوئی اور۔“

”خدارا الماس!“ مہناز زچ ہو کر بولی۔ ”مت اتنی خود سری دکھاؤ۔ بہت نقصان اٹھاؤ گی۔ یقیناً جانو، جہیں ایک بہترین چیز مل رہی ہے۔ یا تو جلد از جلد اسے قبول کر لو، یا پھر۔“

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر گہری سانس لی۔  
”یا پھر کوئی اور فیصلہ سنا دو۔ ہم سب تمہاری جانب سے کسی فیصلے کے منتظر ہیں۔“  
”اس نے سوچ میں گم الماس کو دیکھا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے صبا!“ کشن پر نیم دراز، ہاتھ میں پکڑے ریوٹ سے کھیلتی ہوئی وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں عثمان سے شادی نہیں کر سکتی۔“

صبا نے حد درجہ تاسف سے اسے دیکھا۔

”لیکن کیوں! کوئی ٹھوس وجہ بھی تو ہوگی تمہارے پاس۔“

”وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہن میچ کرتے ہیں نہ طبیعتیں۔ میں ان کی کہنی میں گھبرا جاتی ہوں۔ الجھن ہوتی ہے مجھے۔“ اس نے ریوٹ ایک طرف ڈال کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھالیں۔

”سچ سچ بتاؤ الماس!“ صبا اس کے قریب ہوئی۔ ”یہی ایک وجہ ہے؟“

”کیا جانتا چاہتی ہو؟“ اس نے اپنی چٹکی کا سچ سی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”میرا خیال ہے الماس۔“ وہ واپس سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے فیصلے کی اس عمارت کا ب سے اہم اور مضبوط ستون رضا مراد ہے۔“

”الماس نے ایک نظر اسے دیکھا۔“

”کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں رضا سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔؟“ الماس نے ہنسی اچکائی۔

”شاید۔ کم از کم یہ تو میں جانتی ہوں کہ وہ تم سے شادی کا خواہش مند ہے۔“

”اس نے مجھے کبھی پروپوز نہیں کیا صبا!“ الماس نے سر جھٹکا۔ اور۔ اور۔ مجھے ہی کیا کسی بھی لڑکی کو پروپوز کرنے کے لیے اسے بڑا وقت درکار ہے۔ وہ کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ میں اس کے گھر جا چکی ہوں۔ ایک کمرے کا انتہائی بوسیدہ سافلیٹ ہے جس میں ایک پلنگ اور دو کرسیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ قلیٹ بھی اس کا اپنا نہیں ہے۔ اس کے کسی رشتے دار کا ہے۔ جس نے اس پر ترس کھاتے ہوئے اسے وہاں رہنے کی اجازت دی ہوئی ہے۔ اور۔ اور اس کی آمدنی۔ وہ مہینے بھر میں بمشکل ایک آدھ کانٹریکٹ ہی کرتا ہے۔ ہم اگر کسی جگہ سے چھوٹوں کی چاٹ بھی کھائیں تو بل میں ادا کرتی ہوں۔ وہ۔ وہ مجھے پروپوز کیسے کر سکتا ہے۔ اور اگر کر بھی دے تو میں کیسے ہامی بھر سکتی ہوں۔“

صبا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز میں حد درجہ مایوسی اور جھنجھلاہٹ تھی۔ غصہ تھا، بے بس ہونے کا احساس تھا۔

”میں تمہارا مسئلہ سمجھ چکی ہوں الماس!“ وہ آہستگی سے بولی۔  
”ہاں! بتاؤ مجھے۔ کیا مسئلہ ہے؟ کیا پر اہلم ہے میرے ساتھ؟ میں خود بھی نہیں سمجھ پاتی۔“  
”محض رضا تم سے محبت نہیں کرتا، تم بھی اس کے سحر میں گرفتار ہو چکی ہو عثمان جہیں اس لیے ابھی



نہیں لگتے کہ تم ان سے محبت نہیں کرتیں۔ لیکن تم محبتوں میں اندھا دھند آگے بڑھنے کی قائل نہیں ہو تم جانتی ہو عثمان سے دستبردار ہونے کی صورت میں تمہیں اپنی زندگی کی تمام تر گلوریز سے دستبردار ہونا ہوگا اور یہ تمہیں منظور نہیں۔ دوسری جانب عثمان سے وابستہ ہو جانے کی صورت میں تمہیں اپنی محبت سے ہاتھ دھوئے ہونے کے۔ تم بھی نہیں چاہتیں۔ بس، یہی ایک کشمکش ہے جو تمہارے وجود کے اندر جاری ہے۔“

”میں۔ میں رضا سے۔ ہاؤ پاسیبل۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”نہیں مہا! میں اسے نہیں چاہتی۔“

”پھر؟ کیا وجہ ہے کہ تم اسے نہ چاہنے کے باوجود اس سے ملنے اور ملنے پر مجبور ہو؟ کیا گھنٹوں اس کی آواز سے دل بہلاتی ہو؟ کیا تم اس سے کھیل رہی ہو۔ اور کیا عثمان خان سے بھی کھیل رہی ہو؟ تم۔ تم کس اُبھن میں جھلا ہو؟“

صبا بری طرح زچ ہو گئی۔

”میں تمہیں کیسے سمجھاؤں!“ اس نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کیں۔ ”میں اس کی نہیں، اس کے الفاظ میں دیوانی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آخر عثمان مجھ سے وہ سب باتیں کیوں نہیں کہہ پاتے جانتی ہو صبا! اپنا دل کھول کر میرے آگے رکھ دیتا ہے۔ کسی کشکول کی طرح۔ اور مجھ سے کہتا ہے کہ میں محض اپنی ملکوتی مسکراہٹ کے سکے اس میں ڈالتی رہوں۔ مجھے سامنے بٹھا کر کسی معمول کی طرح مجھے تکتا رہتا ہے۔ میرے حسن کو خراج پیش کرنے کے لیے اس کے پاس الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ اور اس کا یہ خزانہ کبھی خالی ہی نہیں ہو پاتا۔ وہ مجھے دیوانی اور خود کو پچاری کہتا ہے۔ میری آنکھوں پر کہنے کے لیے اس کے پاس بے شمار اشعار ہیں۔ میرے لبوں کی خوبصورتی بیان کرنے کے لیے لاتعداد استعارے ہیں۔ میں اسیر ہو چکی ہوں اس کے لہجہ کی۔ اس کی آواز کی۔ صبا۔“

اس نے آنکھیں کھول کر مایوسی سے اسے دیکھا۔

”عثمان میرے منگیتر ہیں انہیں مجھ سے باتیں کرنے کے لیے غالب کی ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی مشکل سی بات سمجھانے کے لیے نجانے کس کس ادیب کے حوالے دینے پڑتے ہیں۔ میں اکتا گئی ہوں ان سے اور ان کے رویے سے۔“

”مجھے افسوس ہے الماس!“ صبا نے سر جھکا لیا۔ ”لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تم ایک خوفناک جاہلی کی جانب بڑھ رہی ہو۔“

”وہ کیسے۔“ اس کے چہرے پر بد مزگی کے آثار نمودار ہوئے۔

”الماس! جو عورت اپنے وجود کے حسن کے احساس میں اس بری طرح گرفتار ہو جائے جیسا کہ تم ہو چکی ہو، اسے دنیا میں اپنے علاوہ پھر اور کوئی شے نظر نہیں آتی۔ ایسی عورت نہ خود خوش رہ سکتی ہے اور نہ کسی اور کو خوش دے سکتی ہے۔ الماس! کیا تم جان نہیں پائیں کہ رضا تمہارے وجود سے محبت کرتا ہے اور عثمان تمہاری شخصیت، تمہاری پوری ذات کا احترام کرتے ہیں۔ وہ تمہارے حسن کو سراہتے ضرور ہوں گے لیکن لفظوں میں اس کا اظہار اس لیے نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک یہ سچی بات ہوگی۔ الماس! اگر تم رضا سے محبت نہیں کرتی تو عثمان کو اپنا لو۔ رضا کی محبت کا مقابلہ ان کی محبت سے مت کرو۔ کیا تمہیں ان کی ذات کا گہرا اپن محسوس نہیں ہوتا؟ تم کوئی چودہ پندرہ سال کی بچی ذہن کی لڑکی نہیں ہو جس کے نزدیک محض تعریف کے چند الفاظ ہر شے سے زیادہ قیمتی ہوں، یقین کرو الماس! دیوانی کو ایک پچاری کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ جبکہ ایک قابل اعتماد، عالی ظرف ساتھی زندگی کے ہر موڑ پر کام آتا ہے۔ اس کی پوچا کے چند پھولوں کے سہارے تمہاری زندگی نہیں گزر سکے گی۔“

”الماس نے دونوں ہاتھ سے اپنا سر تھام لیا۔ صبا بولتے بولتے خاموش ہو گئی۔

”میرا خیال ہے میں چائے بنا لوں۔“



وہ الماس کا شانہ چھپتا کر باہر نکل گئی۔ اس کے خیال میں جو کچھ اس نے کہا، اس پر غور کرنے کے لیے الماس کو کچھ دیر تنہائی کی ضرورت تھی۔ اسے الماس کے انداز سے خوف آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ عثمان خان کو چھوڑ دینے کا قطعی فیصلہ کر چکی تھی اور اب اسے محض رضا کی جانب سے کسی پیش قدمی کا انتظار تھا۔

”خدا تمہیں عقل سلیم عطا فرمائے الماس۔“ وہ چائے کی چٹی ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔ ”نجانے کس بری کمزری میں یہ رضا مراد تم سے ٹکرا گیا ہے۔ اچھی خاصی پرسکون زندگی بھی تمہاری۔“

چائے بنا کر وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئی تو ایک لمبے کے لیے پتھر بن گئی۔

الماس جا چکی تھی۔

”کیا بات ہے بھئی۔“ عثمان خان اندر آتے ہوئے خوش دلی سے کہہ رہے تھے۔ سنا ہے دشمنوں کے حراج ٹھیک نہیں۔“

کڑھائی کے سیاہ لباس میں ملبوس الماس بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ اس نے بھاری بھاری پچھلے اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”بٹھ سکتا ہوں؟“

”تشریف رکھیے۔“

وہ اس کے قریب ہی ٹھک گئی۔ الماس کے ماتھے پر بڑی ٹخنوں کو انہوں نے ایک نظر دیکھا پھر مسکرا دیے۔

”میں ٹھل تو نہیں ہوا آپ کے آرام میں؟“

”جی؟“ اس نے ابرو اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ”جی نہیں۔ دیسے میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ میں بیمار ہوں؟“

”کسی نے بھی نہیں۔“ وہ ہنسی۔ ”مہناز بتا رہی تھیں آپ کا موڈ دو تین دن سے آف ہے اور آپ کرا بند کیے لیٹی ہیں۔ نہ ہنستی ہیں نہ بات کرتی ہیں۔ میں نے سوچا نادانستگی میں کوئی بھول اگر مجھ سے ہو گئی ہو تو میں بھی ذرا اپنا اعمال نامہ چیک کر لوں۔ کہیے کیا بات ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“

”پھر؟“ ڈپریشن کا دورہ کیوں؟“

”ڈپریشن۔“ وہ اٹھ کھڑی ہو کر بیٹھ گئی۔ ”ہاں۔ ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔“

عثمان نے غور سے اسے دیکھا۔ چاند چہرے کی خیمہ کچھ جھمی جھمی سی تھی۔ آنکھوں کے گرد ہلکی سی سیاہیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا وہ دو تین دن سے بیمار رہی ہو۔

”نہیں دکھائیے۔“ انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”الماس ہولے سے ہنس دی۔“

”آپ ملے آئے ہیں یا میرا چیک اپ کرنے۔“

”ڈاکٹر سے مل گئی کرنے کا یہ پہلا فائدہ آج آپ کو محسوس ہوا۔“ وہ ہنس دیے۔ ”طاقت بھی ہو جائے گی اور چیک اپ بھی۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں اور بے وجہ فیس بھرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”فیس بھرنے کا؟“ انہوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”جی ہاں۔ کیا خبر چاہتے جاتے بل نہیں تھا جائیں آپ مجھے۔“ اس کا انداز بے خبر تھا۔



عثمان زور سے ہنس دیے۔

”اوہو۔ یعنی اس قدر جاننے لگی ہیں آپ مجھے۔“ وہ گفتگو سے ہولے۔  
 ”جان ہی تو نہیں پائی۔“ وہ ہولے سے بڑبڑائی تھی۔  
 ”جی؟ کیا کہا۔“ وہ سن نہ سکے تھے۔

اسی لمحے نسرین نے دروازے پر دستک دی۔  
 ”الماس بی بی۔ فون ہے آپ کا۔“

وہ اسے کارڈ لیس تھما گئی۔

”میرا خیال ہے میں چلتا ہوں۔“ عثمان کھڑے ہو گئے۔

”خدا حافظ۔“ الماس نے ایک نظر انہیں دیکھا اور فون کان سے لگا لیا۔

”ہیلو۔ ہاں رضا! میں کتنے دن سے تمہارے فون کا انتظار کر رہی تھی۔

باہر نکلتے عثمان نے اس کا جملہ سنا تھا۔ وہ کچھ دیر بند دروازے کے پاس کھڑے کچھ سوچتے رہے پھر  
 آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔



”جمننا! میں لان میں ہوں۔ مجھے ایک کپ چائے تو دے جائیں۔“

ہاتھ میں کتاب تھامے وہ لاؤنج میں نکلتے کہہ رہا تھا۔

عفت خانم کے پاس بیٹھی نبیلہ نے ایک نظر اس کے چوڑے شانوں پر ڈالی پھر اٹھ کر کچن کی سمت  
 بڑھ گئی۔

وہ کتاب میں محو تھا جب وہ ٹرے اٹھائے وہاں چلی آئی۔ چوڑیوں کی کھٹک پر اس نے نظر اٹھائی تھی۔

”آپ نے کیوں زحمت کی؟“ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ میں نے تو جمننا سے کہا تھا۔

”اصل میں میرا اپنا موڈ بھی چائے پینے کا ہو رہا تھا۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں نے سوچا، ایک سے دو بچے

ہوتے۔ مجھے اکیلے کچھ کھانا پینا پسند نہیں ہے۔“

وہ خاموش ہو گیا لیکن چہرے پر ایک عجب سا کھنچاؤ واضح تھا۔

”یہ بسکٹ لے لیں۔“ نبیلہ نے پلیٹ اس کی سمت بڑھائی۔

”شکریہ۔ مجھے بس ایک کپ چائے دے دیں۔“

”کوئی شخص سامنے بیٹھا ہو تو کتاب کھولے رکھنا عین بد اخلاقی ہے۔“ وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔

اس نے گہری سانس بھر کر کتاب بند کر دی۔

”یہ لیجیے۔“ اس نے چائے کا کپ اس کی سمت بڑھایا۔

فیروز احمد نے کپ تھام لیا اور ہولے ہولے گھونٹ بھرنے لگا۔

”میں اور عقیلہ پرسوں واپس جا رہے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اوہ۔ اچھا۔ ٹھہرتے کچھ روز اور۔“ اس نے جیسے رسم بھائی۔

وہ مسکرا دی۔ ”اس سے آپ کو کیا فرق پڑے گا۔“

”کس سے؟“ اس نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”ہمارے ٹھہرنے یا نہ ٹھہرنے سے۔“ وہ سر جھکا کر ناخن دیکھنے لگی۔

انداز میں کئی رنگ نمایاں تھے اور وہ ایک بھرپور، جوان مرد تھا۔ ہر رنگ کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا۔



وہ چند لمحے ایسے دیکھتا رہا۔

”نبیلہ بی بی!“ پھر وہ آہستگی سے بولا۔ ”بعض کنویں اندھے، اندھے، خشک ہوتے ہیں۔ کسی امید پر ان میں پتھر پھینکتے رہنا حماقت اور وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ تو اتانیاں وہاں صرف کرنی چاہئیں جہاں سے جواب میں کچھ ملنے کی امید ہو۔“

”جی۔“ وہ ایک لخت ہراساں ہوئی تھی۔ ”میں سمجھی نہیں۔ پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا مطلب تھا۔“  
بوکھلاہٹ میں اس کے ہاتھ سے کیتلی الٹ گئی۔ گرم گرم چائے اس کے ہاتھوں کو جلاتی، کپڑوں میں جذب ہوتی نیچے گرنے لگی۔

ہلکی ہلکی کراہیں اس کے لبوں سے نکلی تھیں۔

”اوہ گاڈ!“ وہ بے اختیار کپ رکھ کر اس کے نزدیک آیا۔ ”یہ کیا کر لیا آپ نے؟“

”وہ اس کے ہاتھ کر دیکھنے لگا۔ گوری جلد پر لال لال نشانات ابھر آئے تھے۔“

”بیٹھی رہیے۔ میں مرہم لاتا ہوں۔“

وہ تقریباً دوڑتا ہوا اندر گیا۔ نبیلہ پلکیں جھپکائے بنا بیٹھی رہ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں گئے ہاتھوں کی ساری جلن، ساری دکھن جیسے پل بھر میں ختم ہو گئی تھی۔ صرف ایک مہربان لمس کا احساس رہ گیا تھا۔  
وہ چند منٹوں میں واپس آ گیا۔ اس کے قریب گھاس پر گھٹنا ٹکا کر بیٹھ گیا اور مرہم ٹیوب سے نکال کر احتیاط سے اس کے ہاتھوں پر لگانے لگا۔

نبیلہ بڑے جذب کے عالم میں اس کے گھنے بالوں، کشادہ پیشانی اور لانی پلکوں کی حرکت کو دیکھ رہی تھی۔ ہاتھوں میں ٹھنڈک سی دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ جو نبیلہ اور عقیلہ سے ملنے آئی تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ان دونوں کی محویت کو پلک جھپکائے بنا دیکھ رہی تھی۔

خوابوں میں بھی اس سے دور رہنے والا کسی اور کے اس قدر قریب تھا۔ اس کے اندر سانسوں کا جوار بھانا اُلٹھنے لگا۔ وہ مڑی اور تیز تیز چلتی گیٹ کی سمت چل دی۔

”ارے صبا!“ نبیلہ نے آہٹ پر مڑ کر دیکھا تھا۔ ”صبا!“

”اس نے آواز بھی دی لیکن وہ باہر جا چکی تھی۔“

ٹیوب بند کرتے فیروز کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے ٹھہرے تھے۔ پھر وہ سر جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

• • •

سفید چادر میں لپٹی وہ اشاپ پر بس سے اُتری تھی۔ جب کا آغاز کیے ہفتہ بھر ہو چلا تھا۔ اور اب اسے اس روٹین کی عادت ہوئی جا رہی تھی۔

”نیلیم۔“ کسی نے پیار سے پکارا تھا۔

اس کے بڑھتے قدم اچانک ہی تھمے تھے۔ تعجب سے مڑ کر دیکھا۔ راجہ اس کے مقابل کھڑا تھا۔ غصے کی ایک لہر اس کے اندر سے اُٹھی۔ اسے کس نے یہ حق دیا تھا کہ وہ اس کو اس طرح سے پکارتا۔

”یوں اکیلی کہاں سے آرہی ہو؟“ وہاں حد درجے بے تکلفی تھی۔

وہاں اتنے لوگ تھے کہ وہ اگر چاہتی تو اس کو اچھے خاصے جوتے پہنا سکتی تھی۔ لیکن اپنی ذات کا تماشا بنانا اسے گوارا نہ تھا۔

غصے کو اپنے اندر دباتی وہ آگے بڑھ گئی۔ اشاپ سے گھر تک کا فیصلہ دس پندرہ منٹ کا تھا اور اس وقت شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔



”کب تک میرے پیار کا جواب پیار سے نہیں دو گی۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔  
 ”تم میرا پیچھا چھوڑ نہیں سکتے؟“ وہ تڑپ کر مڑی۔ ”کیوں ایک عفریت کی مانند میرا پیچھا سلا رہے تم نے؟“

”محبت کرتا ہوں تم سے۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”یہ جو تمہاری موٹی صورت ہے ناں رات رات میرے آنکھوں میں بسائے جاگتا رہتا ہوں۔ کھلی آنکھوں سے سنے دیکھتا ہوں تمہارے۔ دیکھو ناں کتنا بدل گیا ہے میں نے خود کو تمہارے لیے۔ اچھے کپڑے پہنتا ہوں، خوشبو بھی لگاتا ہوں۔ ایک نوکری بھی کر لی ہے۔“  
 ”باہر سے تم چاہے سرخاب کے پر بھی لگا لو ناں تب بھی اندر سے ویسے ہی گنوار کے گنوار ہو گے تم جاہل ہو سرتا پا جاہل۔ شریف بہن بیٹیوں کو یوں سرعام مخاطب کرنا اور ایسی واہیات باتیں کرنا جہالت اور گنوار پن ہے۔ ہونہہ!“

وہ پھری ہوئی آگے بڑھ گئی۔  
 ”ایک دن تمہیں دلہن بنا کر اپنے سامنے نہ بٹھایا تو نام بدل دیتا میرا۔“ وہ بول کر تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ ”اسی جاہل کے گھر آؤ گی تم نیلیم بی بی۔ لکھ لیتا۔“  
 اس کا دل خوف، خجالت اور غم و غصے سے اس تیزی سے دھڑکنے لگا کہ اس سے چلنا دو بھر ہو گیا۔ ہینٹ تھام کر وہ وہیں گلی میں بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا بیٹی۔“ کوئی خاتون وہاں سے گزر رہی تھیں۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“  
 ”جی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کھڑی ہو گئی۔  
 ”میں گھر تک چھوڑ آؤں؟ کہاں ہے تمہارا گھر؟“  
 ”جی۔ بس وہ سامنے ہی ہے۔ میں چلی جاؤں گی شکریہ۔“  
 وہ بھاری بھاری قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

کارپٹ پر نیم دراز وہ بے دلی سے چینل بدل رہی تھی۔ جب نجی خاتون اندر داخل ہوئیں۔  
 ”صبا بیٹی۔“  
 ”جی امی؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”باہر مہمان آئے ہیں۔ چائے تو بنا لاؤ۔“  
 ”کون ہے امی؟“ وہ کھڑی ہو گئی۔  
 ”تمہارے ابو کے دوست کے بیٹے ہیں۔ پنڈی سے یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ ملنے آئے ہیں۔“  
 وہ سر ہلا کر کچن میں آ گئی۔ کچھ دنوں سے بیزاری کی ایک کیفیت اس کے پورے وجود پر طاری تھی کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔

چائے بنا کر اس نے سکٹ اور کچھ اسٹینکس وغیرہ ٹرے میں رکھے اور باہر لے آئی۔ آف وہاں ٹلوہ قمیص میں ملبوس ایک خوش شکل، نوجوان نجمہ بیگم اور توقیر صاحب سے محو گفتگو تھا۔  
 ”السلام علیکم۔“ اس نے ٹرے میز پر رکھی۔  
 ”وعلیکم السلام۔“ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ ”آپ یقیناً صبا ہیں۔“  
 ”جی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔  
 ”بیٹی یہ دانیال ہاشمی ہیں۔ تمہیں اپنے ہاشمی انکل یاد ہیں۔ جن کا ٹرانسفر ہو گیا تھا؟“



”جی۔“ اس نے ذہن پر زور دیا۔ ”شاید۔“

”یہ انہی کے بیٹے ہیں۔ ابھی انہوں نے اپنا کاروبار یہاں شلٹ کیا ہے۔ اپنا بنگلہ بھی یہیں بنوا رہے ہیں۔“ توقیر صاحب بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔

بیٹا میں کھانا تیار کر رہی ہوں کھا کر جانا۔“ نجمہ خاتون بولتی ہوئی انہیں۔

”ارے نہیں آئی۔ کوئی تکلف نہیں۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں بس اب چلوں گا۔ کھانا پھر کسی دن کھاؤں گا۔ اپنے ہی گھر کی بات ہے۔“

”جب اپنے گھر کی بات ہے تو تکلف کیسا؟“ توقیر صاحب نے۔ ”جاؤ بیگم حرمے دار سا کھانا تیار کرو۔“

مبا بھی اندر جانا چاہتی تھی لیکن کچھ دیر اخلاق نبھانے کی خاطر وہیں ٹک گئی۔

”پرہت جی آپ؟“ وہ اس کی جانب متوجہ تھا۔

”بی ایس سی کیا ہے۔ اب ایم ایس سی میں ایڈمیشن لینے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“

”جی۔ مناسب خیال ہے۔“ وہ مسکرایا

”تم لوگ کپ شپ کرو۔ میں ایک ضروری فون کر لوں۔“

توقیر صاحب اٹھ کر اندر کی سمت بڑھ گئے۔

مبا کو غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اسے لگا ان دونوں کو تنہائی جان بوجھ کر فراہم کی گئی ہے۔

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ آنکھوں میں دنیا جہان کی دلچسپیاں بھرے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے

گہرا کر نظریں جھکا لیں۔

”کچھ میرے بارے میں نہیں پوچھیں گی آپ؟“ اس کا انداز شرارتی تھا۔

”جی؟“ وہ چل ہو کر انگلیاں چٹختی لگی۔ ”کوئی ضرورت تو نہیں۔“

”ارے!“ وہ ہنس دیا۔ ”آپ تو بڑی نا سمجھ ہیں۔ محترمہ! مستقبل قریب میں ہمارے ایک دوسرے سے وابستہ ہو جانے کے بڑے گہرے امکانات ہیں۔ موقع مناسب جاوے اور اچھی طرح جان پہنک کر دیکھ لیجئے۔ میں تو آپ کو پاس کر چکا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے اچھے مارکس دے دیے تو کچھ بات کہی ہے۔“

وہ حد درجہ گفتگو مزاح، شوخ و شنگ اور باتونی لگتا تھا۔ لیکن مبا کا دھیان اس کی کسی بھی کوالٹی کی جانب نہ تھا۔ وہ تو اس کے الفاظ سن کر گرم صم ہو گئی تھی۔

ذہن میں سب سے پہلی تصویر فیروز احمد کی بنی تھی۔

”تو فیروز احمد۔ کیا میں تمہیں پائے بنا ہی کھونے لگی ہوں۔“

وہ جیسے اندر ہی اندر اندھیروں میں گرتی جا رہی تھی۔

• • •

وہ اگلے روز فیکٹری جانے کے لیے کپڑے استری کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اہم کوستی بھی یاد کرتی جا رہی تھی۔

ریشم اور مریم پڑوس میں گئی تھیں۔ زلفی اماں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا ہوا تھا۔ اس نے کسی کی بھی آمد کے پیش نظر باہر کا دروازہ کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ باہر صحن میں کسی کے قدموں کی چاپ ابھری تو وہ ہلک لگا چھوڑ کر

کمرے سے نکل آئی۔

”آپ!“ یوسف کو برآمدے کی جالیوں کے پاس کھڑا دیکھ کر وہ گہرا ہی متحی۔

”آئیے۔ اکیلے ہی آئے ہیں۔ شبنم کو نہیں لائے؟“



”وہ ایک ساتھ سوالات کرنے لگی۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر اسے گھورتے رہے۔ اس نے اس کی  
پریشان بالوں اور بڑھی ہوئی شیمو میں وہ اسے کچھ بدلے بدلے سے لگے۔  
”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ وہ پریشان ہو گئی۔  
”تمہیں میری پروا کب سے ہو گئی۔ نیلم بی بی۔“ وہ زبردستی لہجے میں بولے۔ ”کب اس کی کیا بات  
نے میرا، میرے جذبات کا؟“

”یوسف! برائے مہربانی ان باتوں کو پس منظر میں روک دیں یہ باتیں اور ان کے کہنے سے کافایت میری  
ختم ہو چکا ہے۔“

”کچھ ختم نہیں ہوا نیلم۔ کچھ ختم نہیں ہوا۔“ وہ آگے بڑھ آئے۔ ”میں آج بھی تمہیں سوچتا ہوں۔  
آج بھی تمہارے سنے دیکھتا ہوں۔ میرا دل آج بھی تمہارے لیے دھڑکتا ہے۔ میرا نام کس کے نام سے لڑتا ہے  
مجھے خبر ہے نہ پروا ہے۔ میری روح کا ہر رشتہ تم سے جاملتا ہے۔ میں ان باتوں کو کیسے روک سکتا ہوں؟“  
”یوسف۔“ اس کا گلا خشک ہو گیا۔ ”دیکھیے۔ آپ مجھے ہارل نہیں گتے۔“  
انہیں اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔

”آپ۔ آپ چلے جائیں۔“  
”میں کہیں نہیں جاسکتا نیلم۔ کہیں نہیں۔ تم نے اپنے پیار کی بیڑی ڈالی تھی میرے قدموں میں۔  
تم خود بھی چاہو تو مجھے آزاد نہیں کر سکتیں۔“

انہوں نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر خود سے قریب کرنا چاہا۔  
”یوسف۔“ وہ کھٹی کھٹی آواز میں چیخی۔ ”خدارا، یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ چھوڑ پے مجھے۔“  
”میں جل رہا ہوں نیلم۔ صحراؤں میں ننگے پاؤں پھر رہا ہوں۔ مجھے اپنے پیار کی پند باندی بھول  
سمجھ کر دے دو۔“

انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا۔  
نیلم نے اپنا پورا زور لگا کر خود کو چھڑایا اور بھاگتی ہوئی اماں کے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ بند کر  
کے وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔  
”نجانے کتنی دیر گزر گئی۔ باہر اماں اور زلفی کی آواز آئی تو اس نے دوپٹے سے جلدی جلدی پیرا صاف  
کیا اور اٹھ کر کنڈی کھول دی۔

”یہاں بیٹھی ہو۔“ اماں تھکی ہوئی اندر آئی تھیں۔ ”باہر دروازہ کھلا چھوڑ رکھا ہے۔“  
اسے اندازہ ہوا کہ یوسف جا چکے تھے۔

وہ خاموش بیٹھی رہی۔  
اماں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔  
”کیا روتی رہی ہو؟“

”نہیں اماں۔ وہ سلاہ کے لیے پیاز کاٹی تھی۔“ اسے بروقت بہانا سوچا۔  
”اسی وقت انہم اندر آ گئی۔

”اماں۔“ وہ بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔ ”یوسف بھائی آئے تھے۔“  
”اچھا“ اماں کو تعجب ہوا۔ ”کب آئے۔ تم نے تو مجھے نہیں بتایا؟“  
انہوں نے نیلم کو دیکھا۔ وہ چوری بن گئی۔



”جیسا ہے اماں۔ انہوں نے بجو کو گلے سے لگا کر پیار بھی کیا ہے۔ جیسے آپ مجھے کرتی ہیں۔“ وہ واقعہ کی چشم دید گواہ تھی اور نیلم کو خبر نہ تھی۔

اماں سن بیٹھی تھیں اور نیلم کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سما جائے۔

اماں دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

ان کی شاید یہ بھی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ اگر اس سے سوال کریں تو کیا کریں؟ اور نہ نیلم کے پاس ہی کوئی وضاحت تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے نظریں جڑائے اپنے اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھیں کہ درحقیقت کیا ہوا تھا۔

چند لمحوں بعد زلفی بھی اندر آ گیا۔

”بجو! مجھے کھانا نکال دیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔“

”وہ آہستگی سے اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھی تھی۔

”نیلم!“ اماں نے اُسے پیچھے سے پکارا۔ ”انعم کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اسے کل کا سبق یاد کرا دو۔!“

”آؤ انعم۔!“

وہ رُک نہیں۔ نہ پلیٹ رماں کو دیکھا۔ انعم کو پکار کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ جانتی تھی اماں نے اسے یہ ہدایت کیوں کی تھی۔ انہیں ڈرتھا کہیں وہ زلفی کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دے۔

انعم کو کتاب تھا کر، سبق یاد کرنے کی ہدایت کر کے وہ کچن میں آ گئی۔

اس کا ذہن۔ بیک وقت کئی قسم کی سوچوں کی آماجگ بنا ہوا تھا۔ اسے یوسف کے عمل پر حیرانی بھی تھی۔ افسوس بھی تھا۔ غصہ بھی تھا اور اماں کے تاثرات پر خجالت اور ندامت کا احساس بھی دامن گیر تھا۔ انہوں نے اس سے کچھ نہ پوچھا تھا۔ کسی قسم کی وضاحت طلب نہ کی تھی، بس خاموشی کی ایک دیوار چادران کے وجود پر چھا گئی تھی۔ اور وہ زلفی کے لیے روٹیاں پکاتے ہوئے مسلسل اس سوچ میں تھی کہ نجائے اماں نے انعم کے بیان سے کیا معنی اخذ کیے تھے۔ کہیں وہ اس کو تو غلط نہیں سمجھ رہی تھیں؟

”زلفی کے جانے اور ریشم اور مریم کے واپس آنے تک وہ جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر ادھر پھرتی رہی سوچوں کی یلغار ایک مسلسل اضطراب بن کر اس کے رگ و پے میں سماتی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اماں کے پاس جائے اور رو کر انہیں یقین دلا دے کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں اس کا کچھ ہاتھ نہ تھا۔ وہ قطعاً بے قصور تھی۔

پھر جس وقت وہ سونے کے لیے ان کے کمرے میں داخل ہوئی، وہ دیوار کی جانب منہ کیے آنکھوں پر کپڑا لپیٹے لیٹی تھیں۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ وہ کوئی بھی بات کہنے سننے کے موڈ میں نہیں ہیں۔

نیلم آہستگی سے اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ بے بسی کے شدید احساس سے اس کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔

اس وقت اسے یوسف پر شدت سے غصہ آیا۔ اس حد تک کہ اسے ان کے تصور سے کراہیت آنے لگی۔

کیا سمجھا تھا انہوں نے اسے! کیا وہ اس قدر گری ہوئی تھی کہ اپنے بہنوئی کی ذہنی اور جسمانی حکمت اتارنے کا سامان کرتی؟ کیا وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔ یا دین ایمان کہیں بچ آئے تھے؟ کیا ان کے نزدیک

رشتوں باتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی؟ کسی قسم کے تقدس اور احترام کے خیال نے ان کا دامن نہ کھینچا تھا؟

پھر اسے شبہ کا خیال آیا۔

نجائے وہ اس کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتے تھے کہ اپنی سگی بہن کے ساتھ اس کا سلوک انتہائی ناروا ہو گیا تھا۔ نجائے اس غریب کے دل پر دن و رات کیا بیتی ہوگی۔ ہر لحظہ وہ سوچوں کی کسی بھی میں جل جل کر



راکھ ہوتی ہوگی کہ اب وہ بات کرتی تھی تو اس کے لفظ آبلے ڈال دیتے تھے۔

”میری بہن! مجھے احساس ہے کہ میں نے تیرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔“

”اس نے آنسوؤں کے اُمڈتے ہوئے سیلاب میں بہتے ہوئے سوچا۔“

”اپنی انا کا پرچم سر بلند کرتے ہوئے میں نے بالکل نہیں سوچا کہ میں تیرے کول جذبیوں اور مہجی خواہشوں کو ہمیشہ کی نیند سلانے کا سامان کر رہی ہوں۔ لیکن تیری قسم! مجھے اس بات کی خبر نہ تھی کہ جس شخص پر میں دنیا میں سب سے زیادہ اعتبار کرتی ہوں۔ وہ قدم قدم پر مجھے اس قدر بے اعتباری بخشے گا۔ مجھے میرے اپنوں کی نظروں میں ایک تماشا بنا دے گا۔ میرے دل و مانغ کو اضطراب اور بے سکونی کے اتنے خانوں میں بانٹ دے گا۔ اے کاش! مجھے خبر ہوتی تو میں اس شخص کا سایہ بھی تجھ پر نہ پڑنے دیتی۔“

اپنے وجود میں گونجتی چیخوں کا گلا اس نے بڑی مشکلوں سے روکا تھا۔ ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ انا چلائے اتنا چلائے کہ ساری دنیا کو اس کی منتشر دماغی اور اذیت ناک کیفیات کی خبر ہو جائے۔ کسی مریض لا دوا کی مانند وہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ صبح اذانوں کے وقت اس کی آنکھ کچھ دیر کو لگی تھی۔

\*\*\*

”کیا بات ہے۔ رات کو سوئی نہیں ہو؟“

مس نگہت نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”جی۔ سر میں درد تھا۔“ اس نے نظر چرا لی۔ ”نیند ٹھیک سے آئی نہیں۔ اس وقت بھی سر میں دھماکے

سے ہو رہے ہیں۔“

”چلو۔ لنچ ٹائم ہو رہا ہے۔ کچھ پیٹ پو جا کر لیں۔“ وہ اُنھ کھڑی ہوئیں۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔ آپ جا میں۔“ اس نے جھک کر سر میز کی سطح پر ٹکا دیا۔

یہ حقیقت تھی کہ پوری رات جاگنے اور روتے رہنے سے اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سردرد سے پھٹا جا رہا تھا۔

”کچھ کھا لو گی تو آرام آجائے گا۔“ اُنہوں نے خلوص سے مشورہ دیا۔

”آپ مجھے ایک کپ چائے بھجوا دیں۔ ساتھ میں سردرد کی گولیاں۔“ اس نے درخواست کی۔

”جیسی تمہاری مرضی۔!“

”وہ میس کی جانب بڑھ گئیں۔“

سرکری کی پشت سے ٹکا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

لعل سے لب، چراغ سی آنکھیں  
ناک ستواں، جبین کشادہ تھی!“

کسی نے بڑے خواب ناک لہجے میں شعر پڑھا تھا۔

نیلیم نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ زارا مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ دلی نشست پر بیٹھ رہی تھی۔

”قسم خدا کی، تمہیں دیکھتی ہوں تو خوف سے میرا دل اوپر تک بھر جاتا ہے۔“ وہ یوں گویا ہوئی جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ ”جب کسی خوبصورت چہرے پر میں بھول پن بھی دیکھوں تو مجھے یونہی خوف آتا ہے۔“

نیلیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ وہ خاموشی سے اس کی سمت دیکھتی رہی۔ گھونگر یا لے ہالوں



کے دیا جلائے رہے۔ سچ چہرے والی یہ لڑکی پہلی نظر میں طبیعت پر بہت خراب اثر چھوڑتی تھی۔ اور تیز میک اپ سے سچ چہرے والی یہ لڑکی پہلی نظر میں طبیعت پر بہت خراب اثر چھوڑتی تھی۔ نیلم کو وہ اکثر نظر آتی تھی اور جب بھی اس پر نگاہ پڑتی تھی۔ اسے اس کی اول دن والی حرکت یاد آ جاتی تھی۔ وہ اسے سخت نہیں تو کچھ نا پسند ضرور کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ اس کا کیریکٹر اچھا نہیں ہے۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!“

پھر کچھ دیر بعد وہ سنجیدگی سے بولی۔ اس وقت یوں بھی اس کا دل کچھ دیر تنہائی میں بیٹھنے اور خالی الذہن کی کیفیت میں مبتلا ہونے کو چاہ رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی لہذا اس کی گرم جوشی کے جواب میں اس نے نہایت سرد انداز اختیار کیا۔

مس نکمٹ نے چائے بھجوا دی تھی۔ اور ٹرے میں دو کپ تھے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ زارا بھی چائے کا کہتی ہوئی آئی تھی یعنی وہ یہ فارغ وقت نیلم کے ساتھ گزارنے کی خواہش مند تھی۔ اسے یہ سوچ کر سخت کوفت محسوس ہوئی۔

”ابھی تو تم مجھے ہی نہیں سمجھ پائی۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ”خیر، اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔ ویسے بھی ہم کوئی سر بستہ راز تو ہیں نہیں۔ کچھ روز میں تمہیں خبر ہو جائے گی، پھر ہر طرح کی باتوں کا مطلب تم از خود سمجھ لیا کرو گی۔ کتنی چینی ڈالوں؟“

”جتنی بھی ڈال دیں۔“ وہ قدرے بیزاری سے بولی۔

”کم چینی پیا کرو۔“ وہ مسکرائی۔ ”دیکھنے میں ہی شوگر کوئڈ لگتی ہے۔ اور یہاں لوگ میٹھے کے بڑے

شوقین ہیں۔!“

”آپ۔!“ نیلم کو غصہ آ گیا۔ ”آپ بڑی فضول باتیں کرتی ہیں۔ نہایت واہیات! برائے کرم آپ

مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کریں۔“

زارا نے ہاتھ روک کر اسے غور سے دیکھا۔

”چچ چچ۔“ پھر وہ سر ہلانے لگی۔

یہ اظہار افسوس اس نے نجانے کس بات پر کیا تھا۔

پھر وہ اپنا کپ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

”گھر سے نکلی ہو تو دنیا کا سامنا کرنا سیکھو نیلم بی بی“ وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ ”تمہیں تو منافقت کرنا

بالکل نہیں آتی نجانے دنیا تمہارا کیا حشر کرے گی۔!“

اپنا کپ اٹھائے وہ خراماں خراماں سیڑھیوں کی جانب چل دی۔ نیلم کا دل چاہا پیچھے سے اسے کوئی چیز

دے مارے۔ وہ اس کے اُلجھے ہوئے ذہن کو مزید الجھا گئی تھی

\*\*\*

وہ کچن میں کھڑی سالن بھون رہی تھی۔ جب کسی نے پیچھے سے اس کا دامن کھینچا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ منہی مومنہ اس کا دامن تھامے کھڑی تھی۔

”ارے۔ موی!“ اس نے جھک کر اسے اٹھالیا۔ کب آئیں؟“

چولہا بند کر کے وہ اس کا گال چومتی باہر نکل رہی تھی جب اچانک ریاض بھائی سامنے آ گئے۔

”السلام علیکم!“ اس نے مسکرا کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام جیتی رہو۔!“ وہ جیسے اس کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ ”کیا ہو رہا ہے۔ اکیلے اکیلے کیا



کھایا جا رہا ہے؟“

”کھایا نہیں پکایا جا رہا ہے۔ کچی پالک پکا رہی تھی۔ چچی جان نے فرمائش کی تھی خاص طور پر۔ آپ لوگ آگئے ہیں تو کھانا کھا کر جائیے گا۔!“

”اس نے بات کرتے کرتے باہر نکلنے کی کوشش کی۔“

”آمنہ کہاں ہیں؟“

”آمنہ تو گھر پر ہے۔ بس میں اور مومنہ ہی ہیں۔“

”شبیم کو پہلی بار احساس ہوا کہ جان بوجھ کر اس کے آگے اس طرح کھڑے ہیں کہ وہ چاہتے ہوئے بھی باہر نہیں نکل سکتی۔“

اس نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا پھر خود بخود اس کی نظریں جھک گئیں اور جسم کا سارا خون گالوں پر دوڑنے لگا۔ اسے زندگی میں کبھی مرد کی ایسی نظروں کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔

”راستہ دیں ریاض بھائی!“ اس کے لہجے میں تلخی در آئی۔

”ارے!“ وہ پھینکی سے ہنسی ہنستے ہوئے ایک طرف ہو گئے۔ ”یہ لو کتنی جگہ پڑی ہے۔ تم کی دھواں پان لڑکی کے نکلنے کو تو ایک معمولی سا سوراخ بھی بہت ہے۔ کیا بات ہے کھانا پینا سب چھوڑ رکھا ہے کیا!“

”وہ اس کے پیچھے پیچھے صحن میں آگئے جہاں چچی بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ ثریا اور یونس بھائی حسب معمول کہیں گھومنے گئے ہوئے تھے۔ گھر میں بس وہ اور وحیدہ چچی ہی تھیں۔“

”آمنہ کو بھی لیتے آتے تو اچھا تھا۔“ چچی جان نے چھالیہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”کئی دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ریاض میاں تم نے تو مجھے میری بیٹی سے بھی ترسا دیا۔“

”ارے کمال کرتی ہیں امی آپ بھی۔ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ کا پورا حق ہے اس پر، جب جی چاہے آکر مل لیں۔“ وہ خوش دلی سے ہنسے۔

”میرے حقوق کی اتنی خبر ہے تو کچھ اپنے فرائض کا بھی لحاظ کرو۔“

چچی جان داماد کو کچھ ایسا خاص پسند نہیں کرتی تھی۔ اور ان کی باتوں سے بھی اس کا اظہار ہوتا رہتا تھا۔ ریاض ہنس کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وہ خاموش بیٹھی دوپٹے کے کنارے سے اُلجھ رہی تھی۔

”اور بھئی شبیم! یہ اپنے یوسف میاں کہاں ہوتے ہیں آج کل!“ انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

”یہیں ہوتے ہیں۔“ وہ مختصر ابولی۔

”اچھا! ہمیں تو نظر نہیں آتے“ انہوں نے قہقہہ لگایا ”تم کہیں دل کی آنکھوں سے تو نہیں دیکھتیں؟“

وہ ہر لمحہ تمہیں اپنے ارد گرد ہی نظر آتے ہوں۔ ہیں۔“

شبیم نے انکی بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ یوں بھی پچھلے کچھ دنوں سے ان کی جانب سے جی عجیب و غریب رویے کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ اس سے وہ ان کی جانب سے برگشتہ سی ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں یونس بھائی اور ثریا بھی آگئے۔

”آمنہ بھائی کو کیوں نہیں لائے بھائی؟“ ثریا نے سب سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔

”بھئی، وہ کچھ ضروری کام کر رہی تھی۔“ وہ بار بار یہی سوال ہونے پر جھنجھلا سے گئے۔ ”مومنہ باہر چلنے کی ضد کر رہی تھی میں اسے گھمانے نکلا تو سوچا یہاں بھی چکر لگا لوں۔ کیا قیامت آگئی۔ آمنہ کو نہ لانے سے۔“

”چلو ثریا! کھانا لگا لو!“ چچی نے داماد کا موڈ بگڑتا دیکھ کر بات بدلی۔

”یوسف بھائی آجاتے تو!“ اس نے سوالیہ نظروں سے شبیم کو دیکھا۔



”وہ جب آئیں گے کھائیں گے!“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”سب کو بھوک لگی ہے۔ چلو کھانا لگاتے ہیں۔“

دل ہی دل میں کہتی وہ کچن میں آگئی۔ ”آج سے پہلے وہ کب کھانے کے وقت پر دستیاب ہوئے ہیں۔“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”اپنے ناکام عشق کا سوگ منانے سے انہیں فرصت ہی کب ہے۔ جو وہ گھر اور گھر والوں کا سوچیں!“

”کھانا نکال کر وہ باہر دسترخوان بچھانے آئی تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ یوسف، ریاض بھائی سے محو گفتگو تھے۔ اس پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر انہوں نے چہرہ پھیر لیا۔ اس کے جسم میں گرم گرم لہو پوری روانی سے دوڑنے لگا۔ ان کے لمحہ بھر کے عمل میں جو حقیر اور ذلت چھپی ہوئی تھی اسے محض شبنم ہی محسوس کر سکتی تھی۔ گویا وہ اس پر نظر ڈالنا تک پسند نہیں کرتے تھے۔

”کھانے کے دوران بھی نوالے اس کے حلق میں پھنستے رہے، اور وہ بار بار پانی کا گلاس لیوں سے گاتی رہی۔

پھر چند لقمے لے کر وہ اٹھ گئی اور اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس شخص سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ پل بھر میں کر ڈالے اور پھر سب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے سکون کا سانس لے۔

لیکن وہ جب بھی ایسا سوچتی، اماں کا کمزور مرجھایا ہوا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا اور وہ کسی سب کچھ ہارے ہوئے جواری کی سی بے بسی سے دو چار ہو جاتی۔ غصے اور جذبہ انتقام کی لہریں اماں کے تصور سے گرا کر چپ چاپ لوٹ جاتیں۔

شکل کے انتہائی احساس سے چور وہ تکیے سے کمر نکائے۔ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ دروازے پر آہٹ سن کر بھی اس نے آنکھیں کھولنے کی زحمت نہ کی۔ اب وہ بھی ان کے چہرے پر نظر ڈالنے کے خیال سے کونٹ میں جٹلا ہو جاتی تھی۔

بستر پر رکھے اس کے ہاتھ پر کسی ہاتھ کا دباؤ پڑا تو وہ زور سے اُچھل پڑی۔ ریاض بھائی اس کے قریب بیٹھے تھے۔

”آپ؟“

”وہ حواس باختہ سی ہو گئی۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ دوپٹہ دور کرسی پر پڑا تھا۔

”گھبرا کیوں گئیں شبنم؟“ وہ ہمدردی سے کہہ رہے تھے۔ ”میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔“

”آپ اوپر کیوں آئے؟ میرا مطلب ہے کوئی کام تھا تو مجھے آواز دے لی ہوتی۔“ وہ عجب تذبذب کا شکار تھی۔

”نہیں بھئی کام کیسا۔ میں جا رہا تھا سوچا تمہیں بھی الوداع کہتا چلوں۔ لیکن تمہاری یہ حالت دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ جسم سے ڈکھ واندوہ کی تصویر لگ رہی تھیں۔ میں تمہارا درد سمجھتا ہوں شبنو!“

”مجھے کوئی ڈکھ نہیں۔“

اس کے زخموں سے چور دل پر انہوں نے جیسے نمک چھڑک دیا تھا۔ سر جھٹک کر بولی۔

”جب شوہر اپنی بیوی کو اس کا جائز مقام نہ دے، اس کے حقوق سے چشم پوشی اختیار کرے، قدم قدم پر اسے اپنی بے تعلقی کا احساس دلائے تو اس سے بڑا دکھ اور کیا ہو سکتا ہے شبنم!“

”وہ سر جھکا کر رہ گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی پلکیں پھٹتی چلی تھیں۔

”مجھے تو یوسف میاں کی عقل اور سمجھ پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا تھا۔ تم ہی حسین لڑکی کو نظر انداز کرنے



والا شخص یا تو آنکھوں کا اندھا ہو سکتا ہے یا عقل کا اندھا۔ ارے، تمہیں تو دیکھ کر پیار کرنے کو جی کرتا ہے۔  
اس کا جھکا ہوا سر حیرت سے اٹھا۔

”ریاض بھائی!“ وہ شخص اتنا ہی کہہ سکی۔

”کیا بھائی بھائی کی رٹ لگائے رکھتی ہو۔“ وہ ہنستے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ ”ارے شورانی قسم کیا اندازہ ہوگا کہ حسینوں کے نازک لبوں سے ایسے الفاظ کس قدر قتل گتے ہیں۔ گراں گزرتے ہیں۔“  
اس کی پیشانی کی شکنوں میں اضافہ ہوا تو وہ دروازے کی سمت بڑھ گئے۔

”آمنہ بہت یاد کرتی ہے تمہیں۔ چکر لگا لیا کرو۔ یوسف میاں نہ سہی، ثریا اور تم دونوں مل کر ہی آجلا کر ان کے جانے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی۔ ریاض بھائی کا واضح اشارہ اسے پریشانی میں مبتلا کر رہا تھا..... نجانے وہ اس سے کیا چاہتے تھے؟“  
”تمہیں تو دیکھ کر پیار کرنے کو جی کرتا ہے!“

”اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا! یہ الفاظ نہ تو کوئی بھائی ادا کر سکتا ہے نہ بہنوئی۔ آخر وہ اسے کی نظروں سے دیکھتے تھے؟

پھر اسے ان کی نگاہیں یاد آئیں۔ بے باک، جسم کے آر پار ہو جانے والی نظریں، جن سے چپے کپکپ کرتا تھا۔

اس کے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ ایک مرد کا لفظوں اور نظروں دونوں سے ہونے والا دل کا اظہار اس کے لیے بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ یوسف نے تو کبھی اس پر استحقاق بھری ایک نظر تک ڈالنا گوارا نہ کرتی تھی۔ اس کا دل ایک عجب بوجھل پن کا شکار ہونے لگا پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اپنی کیفیات اسے خود ہی سمجھ میں نہ آرہی تھیں۔



چائے کی پیالی میں چچ ہلاتے ہوئے اس نے نادانستہ ہی نظر اٹھائی تھی۔ نچلا ہونٹ دانٹوں میں دبائے آنکھوں میں دلچسپی بھرے وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ مہمانے گھبرا کر نظر جھکا لی۔  
”نجانے میں اتنی جلدی نروس کیوں ہو جاتی ہوں۔“ اس نے سوچا۔

”بھئی نجمہ بیگم! میں تو آپ کی بیٹی پر سو جان سے فدا ہو گئی ہو۔“ مسز ہاشمی اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”بڑی با ادب، سلیقہ مند بچی ہے۔ مجھے تو پہلی نگاہ میں ہی اتنی اپنی اپنی سی لگی کہ ساتھ ہی لے جانے کو جی چاہنے لگا۔ بس آپ جلد از جلد ہمیں جواب دیں اور وہ بھی مثبت جواب۔ خدا نے چاہا تو ہمارے پاس بہت خوش رہیں گے۔“

وہ بے حد صاف گو خاتون تھیں۔ مہمان کے چہرے پر سرخ سنہری رنگ بکھر گئے۔ یہ نہیں تھا کہ انے دانیال ہاشمی میں کوئی دلچسپی تھی لیکن ایک جوان لڑکے کے سامنے یہ ذکر کسی بھی لڑکی کے چہرے پر حیا کی سرفرازی سمجھ سکتا تھا۔

نجانے نجمہ بیگم کیا کہہ رہی تھیں۔ وہ اچانک ہی سننے سمجھنے کی صلاحیت کھونے لگی تھی۔ منتشر سوچوں کے ساتھ وہ ادھر ادھر ڈولتے قدموں سے اٹھ کر اندر آ گئی۔

لاؤنج میں قالین پر بکھرے کشتوں کے درمیان بیٹھ کر اس نے ہاتھوں کی انگلیوں سے کنپٹیوں کو دبا دیا۔ ابھی کل کی ہی بات تھی۔ نجمہ بیگم اور تو قیر صاحب دانیال ہاشمی کی تعریفوں میں زمین آسمان ملائے دے رہے تھے۔ اور اس میں شک کی کچھ گنجائش بھی نہ تھی۔ وہ واقعی قابل تعریف لڑکا تھا۔ خوش شکل بڑھاپا تھا۔



اخلاق و آداب سے واقف، بذلہ سنج اور اپنائیت اور خلوص سے بھرا ہوا۔ پھر اچھا خاندان اور شاندار طرز زندگی اس کے اضافی اوصاف تھے۔ حقیقت یہی تھی کہ اس کا رشتہ کسی بھی لحاظ سے مسترد کیے جانے کا حق دار نہ تھا۔ اگر امی اور پاپا نے مل کر ہاں کر دی۔ تو!

اس کے بعد ایک بڑا سا سوالیہ نشان نظروں کے سامنے آتا تھا اور وہ سوچ سوچ کر تھک جاتی۔ ”ایسی کون سی خوبی ہے فیروز احمد تم میں جو میں کسی طور پر تمہیں نظر انداز نہیں کر پاتی حالانکہ تمہارے مقابل دانیال ہاشمی جیسا خوبصورت شخص ہے۔ شاید اصل خوبی میری بے ریا محبت ہے۔ کمال تمہارا نہیں میرا اپنا ہے۔ اور پتا نہیں یہ کیا ہے۔“ وہ بڑبڑائی! ”کمال یا حماقت۔ محبت یا نری بے وقوفی۔“ اسے خبر نہ تھی وہ لوگ کب گئے۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی تھی، ہمیشہ کی طرح نکلے پاؤں۔ ٹیرس کے ٹھنڈے فرش پر کھڑی رات کے گہرے سناٹے کو سن رہی تھی۔ پیچھے سے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ چونک اٹھی۔ مڑ کر کمرے میں واپس چلی آئی۔ نجمہ خاتون ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا مے کھڑی تھیں۔

”ارے امی! آپ نے کیوں زحمت کی۔ میں تو جاگ رہی تھی۔ لے لیتی خود ہی۔“  
 ”کوئی حرج نہیں۔“ وہ مسکرائیں۔ ”کتنی کمزور ہو گئی ہے میری بیٹی۔ اور میں کیا دودھ کا گلاس لانے سے کھس جاؤں گی؟“  
 ”آئیں بیٹھیں۔!“

اس نے ان کے ہاتھ سے گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ اس کے سامنے بچے سے فیک لگا کر بیٹھ گئیں۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“ صبا نے غور سے انہیں دیکھا۔  
 ”سوچ رہی ہوں، میری ایک ہی بیٹی ہے۔ وہ بھی چلی جائے گی تو کتنا سونا ہو جائے گا میرا آنگن!“  
 وہ یک بیک بے حد اداس اور دل گیر نظر آنے لگیں۔  
 ”میں۔ میں کیوں کہیں جانے لگی۔ اپنی پیاری امی کو چھوڑ کر!“  
 ”ساری بیٹیاں اپنی پیاری ماؤں کو چھوڑ کر جاتی ہیں۔“ وہ اداسی سے مسکرائیں۔  
 صبا نے گہری سانس بھری۔

”دانیال ہاشمی کے پروپوزل کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ مجھے اور تمہارے والد کو تو یہ رشتہ بہت ہی پسند آیا ہے۔ ایک دو جگہ سے اور بھی لوگوں نے کہا ہے لیکن دانیال جیسا لڑکا شاید ہی کہیں ملے۔ تمہارا کیا خیال ہے بیٹی۔!“

وہ سر جھکا کر دل کی دھڑکنوں کو کتنی رہی۔ کیا کہتی! کس امید پر کہتی؟ کسی اور کا نام ماں کے سامنے پیش کرنے کی جسارت بھلا کس کے مان کے سہارے کرتی۔ محبت کے کھیل میں تو وہ شروع سے صرف ہارتی آئی تھی۔ جیتا تو کچھ بھی نہ تھا جسے ماں کے حضور پیش کر پاتی۔

”اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو؟“ وہ ہولے سے ہنس دیں۔ تمہارے پاپا نے کہا تھا اس لیے میں پوچھنے چلی آئی۔ میں جانتی ہوں، کوئی اور بات ہوتی تو میں پہلے سے آگاہ ہوتی خیر، پھر بھی فیصلہ بہر حال تمہارا اپنا ہوگا۔ ابھی آرام سے سو جاؤ۔ دانیال کی والدہ اگلے ہفتے آئیں گی۔ وہ تو انگوٹھی پہنانے کا کہہ رہی تھیں لیکن تمہارے پاپا نے منع کر دیا۔ وہ تم سے پوچھے بغیر کوئی جواب بھی دینا نہیں چاہتے۔“  
 ان کے جانے کے بعد وہ دیر تک سوچتی رہی۔ لے دے کے ذہن میں ایک ہی مہربان چہرہ آتا تھا۔



”لیکن تم بھی کیا کر پاؤ گے!“ اس نے مایوسی سے سوچا تھا۔



”لگتا ہے رو دیں گی!“ اس نے بغور صبا کا چہرہ دیکھا۔ آخر ہوا کیا ہے؟“

وہ ہونٹ کانٹے ہوئے آنسو روکنے کوشش میں مصروف تھی۔ اور جب اس انتہائی کوشش کے وقت کوئی کوشش کے ناکام ہو جانے کی پیشن گوئی بھی کر دے تو آنسوؤں پر بند باندھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

”ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔“ کئی قطرے اس کے سلونے ہاتھوں پر گرے۔

”ارے صبا!“ وہ گھبرا گیا۔ ”کیا ہوا ہے؟ دیکھیں کچھ تو بولیں۔ ہر چند کہ یہ نمکین پانی از خود بہت کچھ کہہ رہا ہے۔ لیکن یقین جاپے مجھے اس کی زبان بالکل سمجھ میں نہیں آتی یہ خوشی کے آنسو ہیں یا غم کے یا پریشانی کے ہا۔ ہا۔ خیر مجھے آخر دماغ لڑانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ زبان کیوں نہیں کھولتیں؟“

”تم چپ ہو تو میں کچھ کہوں۔“ وہ جھلا گئی۔

”یہ بات ہے تو لیجیے!“

اس نے جھٹ ہونٹوں پر انگلی رکھی ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے اسے بولنے کا اشارہ کیا۔

”میں نے تمہیں دانیال ہانگی کے بارے میں بتایا تھا۔ کل اس کی والدہ باقاعدہ پروپوزل لے آئی ہیں۔“

”اوہ نو۔!“ وہ یک بیک سیریس ہو گیا۔ ”پھر کیا طے پایا؟“

صبا نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”امی نے مجھے سوچنے اور پھر جواب دینے کے لیے کہا ہے۔“

”کیا جواب ہے آپ کا؟“ وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”شہروز!“ صبا نے پھر جھلا کر کہا۔ ”تم صورت حال کو اتنا ہی سمجھتے ہو جتنا میں خود۔ یہ سوال تم اپنے

آپ سے بھی کر سکتے ہو۔ بتاؤ، میرا جواب کیا ہونا چاہیے؟“

اس نے گہری سانس بھری، اور کچھ سوچنے لگا۔

”فیروز بھائی نے میرے سارے اندازے غلط ثابت کر دیے ہیں۔“ پھر وہ بولا ”میں سمجھتا تھا دو نرم،

کوئل جذبوں سے متاثر ہو کر اپنی سمت خلوص سے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو ضرور تھامیں گے۔ لیکن انہوں نے تو خود

پر وہ مضبوط خول چڑھا لیا ہے، جسے شاید وہ خود بھی چاہیں تو توڑ نہ پائیں گے!“

”وہ ہولے سے ہنس دی۔“

”انہیں تو شاید یہ بھی خبر نہ ہو شہروز! کہ ان کی جانب کوئی پر خلوص ہاتھ بڑھا بھی تھا یا نہیں، انہیں تو

شاید علم ہی نہ ہو کہ وہ کسی کے نرم، کوئل جذبوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور جب انہیں خبری نہیں تو

پھر الزام کیسے، شکوہ کیسا؟“

”تو پھر کیوں نہیں آزماتیں اپنے جذبوں کی سچائی کو۔“ اس نے صبا کو دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”کیوں نہیں بتاتیں انہیں کہ آپ کے پاس ان کے نام پر کیا کچھ محفوظ رکھا ہے۔ کتنی محبتیں، کتنی

توقعات، کتنی امیدیں، کتنی دعائیں۔ یہ سب ایک مرتبہ انہیں بتا تو دیں تاکہ بعد میں کسی قسم کا کوئی تاسف کوئی

پچھتاوا تو نہ رہ جائے۔“

”نہیں!“ وہ کانپ سی گئی۔ ”میں ان سے نہیں! میں یہ سب کچھ کہہ سکتی تو آج تک کہہ نہ چکی ہوتی!“



”صبا!“ اسے غصہ آ گیا۔ ”ایسی بزدلی بھی کس کام کی۔ پھر محبت کی ہی کیوں تھی۔ چاہا ہی کیوں تھا کسی کو۔ جس کام کا بندے میں حوصلہ ہی نہ ہو، اس کا بیڑا اٹھانے کی حماقت ہی کیوں کی جائے۔“

”میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے شہروز۔ اگر ان کے دل میں میرے لیے کوئی جذبہ نہیں ہے تو پھر یہ بھیک کیوں مانگوں۔ کیا ملے گا؟ شرمندگی، ندامت اور بس۔!“

”کہہ کر تو دیکھیں صبا!“ اس نے التجا کی۔ ”کیا خبر یہ پتھر کا بت عشق کی آغ سے پکھل ہی جائے۔“

”بت کبھی نہیں پکھلتے شہروز!“ وہ قدرے افسردگی سے بولی۔

”پھر ٹوٹ جاتے ہیں صبا۔ میں نہیں چاہتا میرا بھائی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ کیا آپ ایسا چاہیں گی؟ اگر آج آپ بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر کسی اور کی دنیا بسانے چل دیں تو کون ہے جو پھر ایسا کر پائے گا۔“ وہ سخت اداس ہو گیا تھا۔

”میں کیا کروں شہروز؟“ وہ درحقیقت رو دی۔

”میرا کہا مان لیں صبا! ایک بار بس ایک بار اپنے جذبے تمام تر سچائیوں کے ساتھ ان پر عیاں کر دیں۔ اور پھر دیکھیں، ان پر کتنا اثر ہے۔“

”تم۔ تم مجھے بھیک مانگنے کے لیے کہہ رہے ہو شہروز۔“ اس کا لہجہ بھرا رہا تھا۔

”میں آپ سے بھیک مانگتا ہوں صبا! اپنے بھائی کی خوشیوں کی، اسے زندگی کی بہاروں کی مست لانے کی کوشش کریں۔ آپ، آپ جو کچھ ان سے کہیں یہ سوچ کر کہیے گا کہ وہ سارے لفظ آپ نے مجھے بھیک میں دیے۔“

”شہروز!“ وہ چیخ اٹھی۔ ”پاگل۔!“

ایک زوردار چپت اس نے شہروز کے گال پر رسید کی تھی۔

دونوں بھیگی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر مسکرا دیے۔

وہ حسب معمول آٹھ بجے اپنی سیٹ پر موجود تھی۔ مس نکلت آج چھٹی پر تھیں۔ اس لیے اسے دن انتہائی مصروف گزرنے کا پورا یقین تھا۔

اس کی سیٹ مین ہال میں بنائے گئے پارٹیشن میں تھی۔ گلاس والہ کی بدولت سارا دن آنے جانے والوں کی نظریں اس کا طواف کرتی تھیں۔ شروع شروع میں تو وہ اس بے حجابی سے بے حد گھبرائی تھی مگر پھر چند دنوں ہی میں عادت ہو چکی تھی۔ وہ کوشش کرتی کہ فارغ وقت میں بھی نظریں جھکائے اپنے کسی کام میں مصروف رہے۔

سوا آٹھ بجے پہلی گھنٹی بجی۔

”لیس سر!“ اس نے ریسیور اٹھایا

”مس نیلم۔ ذرا میرے کمرے میں آئیے۔“

”اوکے سر!“

یہ فون عبا کی صاحب کے کمرے سے تھا۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”عبا کی صاحب کے اپارٹمنٹ کیے گئے اسٹاف میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے۔ چہرہ۔!“

”زارا کا اول دن کا ادا کیا ہوا جملہ اب تک اس کی سماعتوں میں محفوظ تھا۔ یہ جملہ اور اس میں چھپی ہوئی طنز و تمسخر وہ بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔ ہر چند کہ زارا جیسی لڑکی کے لبوں سے نکلنے والی فضول باتوں کو وہ کوئی اہمیت دینے پر ہرگز تیار نہ تھی، پھر بھی محتاط رہنا چاہتی تھی۔

مس نکلت بھی کسی مخصوص شخص کا نام لیے بغیر اسے اکثر و بیشتر بدانتیں کرتی رہتی تھیں۔ یہ کہ وہ اپنی



حدود کا از حد تعین کرے اور پھر انکی سختی سے پابندی کرے۔ یا پھر یہ کہ کسی بھی شخص سے ضرورت سے زیادہ چیت کرے نہ تعلقات بڑھانے کی کوشش کرے۔ اپنا ایچ ایسا قائم کرے کہ ہر کوئی اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو جائے۔  
 ”میں اندر آسکتی ہوں سر؟“  
 ”آئیے؟“

وہ نہایت سنجیدگی سے کسی کام میں مصروف تھے۔ سفید کاغذ پر بچسٹا ہوا قلم لہو بھر کے لیے لگی رہا تھا۔ وہ خاموشی سے جا کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔  
 تقریباً پانچ منٹ بعد وہ قارٹ ہوئے تھے۔  
 ”ارے! بھئی آپ کھڑی کیوں ہیں۔ بیٹھ جائیں۔“  
 اسے کھڑا دیکھ کر انہوں نے حیرت سے کہا۔  
 ”شکریہ سر!“ اس نے بیٹھتے ہوئے ایک نگاہ ان پر ڈالی۔  
 چالیس سینتالیس کے لگ بھگ عمر، آنکھوں پر سیاہ فریم کے چشمے، بھاری پتلون اور کپڑوں پر صاف ہوتے بالوں کے ساتھ وہ اسے نہایت مہذب اور خلیق محسوس ہوئے۔  
 ”جی مس نیلم!“ وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ کیسے کیسا محسوس کر رہی ہیں۔ ہاب مشکل تو نہیں کوئی بات تکلیف دہ تو نہیں؟“  
 ”نہیں سر۔ ایسی کوئی مشکل نہیں ہے۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ”آہستہ آہستہ سب کچھ میں آجائے۔“  
 ”مس سمجھت بھی بہت تعاون کرتی ہیں۔!“

”اولس شی از دیری کو آریو پر سن۔ دیری ٹائس۔!“ انہوں نے مس سمجھت کو سراہا۔  
 ”میں نے انہیں ہدایت کی تھی کہ آپ کا خاص خیال رکھیں۔ دراصل یہاں کا ماحول ایسا ہے کہ لڑکیاں ذرا گھبرا جاتی ہیں۔ ماحول سے میری مراد ہے جس جگہ مرد اور خواتین مل کر کام کریں۔ وہاں آپ کو گھبرانے کی لڑکیاں بہت جلد۔۔۔ خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پاتیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو جان لینے لگتی ہیں۔ کچھ لیتے ہیں تو پھر مشکل نہیں ہوتی، میں نے آپ کو یہی دیکھنے کے لیے بلایا تھا کہ کہیں آپ گھبراؤ نہیں گئیں۔ ہاب بھی تو آپ نے پہلی مرحلہ کی ہے۔“  
 ”جی سر۔!“ اس نے ہنسا ہوا سر اٹھایا۔

”دوسری بات یہ کہ کبھی کبھار ہمیں چھوٹی موٹی شکایتیں موصول ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں آپ فلاں سے جلدی نہیں ملا یا فلاں وقت آپ پر ڈیوٹی پر نہیں تھی۔ کام ڈرا جم کر اور جانفشانی سے کرنے کی عادت لائیں۔ ترقی کریں گی۔“  
 ”میری شکایت آئی تھی سر؟“ وہ پریشان ہو گئی۔ میں تو سر۔ چائے بھی نہیں پڑھوا رہی ہوں۔“  
 ”کرتی ہوں کہ ہر کال جلد از جلد ملاؤں۔ میں تو سر۔!“  
 ”اوہ نہیں بھئی۔“ وہ فیس دیے۔ ”آپ لطف سمجھ رہی ہیں۔ یہ تو قبل از وقت کی تھی ہدایت تھی ہاب۔ محتاط رہیں۔ دیے آپ کو کبھی بھی کوئی پرابلم ہو، کسی شخص سے کسی قسم کی شکایت ہو، آپ میرے پاس آئیے۔“  
 ”تھیک یو سر۔!“  
 اس نے اٹھتے ہوئے انہیں ممنونیت سے دیکھا۔ وہ ہولے سے مسکرا کر اپنی فائل کی ہاب کی طرف



اپنی سیٹ پر آتے ہوئے وہ تنفر سے سوچ رہی تھی۔ اسے زارا تائش نامی اس لڑکی پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ جس نے اتنے شریف، مہذب اور کوآپریٹو انفر کے لیے اس کے دل میں بدگمانی پیدا کرنا چاہتی تھی۔  
”چہرے سے ہی کتنے مہربان اور شفیق نظر آتے ہیں۔“ وہ سوچ رہی تھی۔



”ای! میں نے آپ سے ایک ذکر کیا تھا۔“

وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بڑے محتاط لہجے میں کہہ رہے تھے۔  
عفت خانم نے ایک نظر بیٹے کے چہرے پر ڈالی۔

”بیٹا! بات یہ ہے کہ تم جانتے ہو میں ان لڑکیوں کو کس مقصد کے تحت یہاں لائی تھی۔“ انہوں نے کچھ دیر سوچ کر بات کا آغاز کیا۔

”یہ بات کلی طور پر نہ سہی، بہر حال کچھ نہ کچھ یہ بچیاں بھی سمجھتی ہیں۔ اب اگر ان کی موجودگی میں، میں تمہارے لیے رشتہ دیکھنے یا بات کرنے جاتی ہوں تو کہیں بچیاں دل برا نہ کریں۔ یہی سوچ کر یہ پروگرام ملتوی کر رکھا ہے۔ جمعرات کے دن کی سیٹیں بک ہیں۔ شہروز انہیں چھوڑنے جا رہا ہے۔ میں انشاء اللہ جسے کے دن ان لوگوں کے ہاں چلی جاؤں گی۔“

”بہتر!“ وہ بولے۔ ”دراصل جلدی ان لوگوں کو ہے مجھے نہیں۔ میں چونکہ کہہ چکا تھا کہ والدہ کو بچپنوں کا لہذا وہ لوگ بار بار کہلو اور ہے ہیں کہ والدہ سے کہیں جلد تشریف لائیں۔ مجھے ہر بار معذرت کرنا عجیب سا لگ رہا ہے۔“

”بیٹا! کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم لڑکی پسند ہی کر لیں۔“ عفت خانم نے قدرے تامل سے بولیں۔  
شہروز مسکرا دیے۔

”میں کہہ چکا ہوں امی جان کہ شکل و صورت کے معاملے میں میں بہت قناعت پسند ہوں لہذا آپ لڑکی کی صورت کو مسترد کر آئیں۔ اس بات کا تو امکان نہیں۔ جہیز وغیرہ کی ہماری ڈیمانڈ نہیں ہوگی۔ رہ گئی بات نجات اور شرافت کی تو اس کی تحقیق میں اپنے طور پر کروا چکا ہوں۔ لڑکی کے والد نہایت شریف، متقی اور پرہیزگار قسم کے شخص ہیں۔ ہیڈ کلرک ہیں محکمہ تعلیم میں۔ پھر بھی آپ کو کوئی اعتراض ہو تو یقین رکھیے، میں کوئی بھی قدم آپ کی رضا کے بغیر نہیں اٹھا سکتا۔ اتنا اعتماد تو یقیناً آپ کو مجھ پر ہوگا۔“

عفت خانم سانس بھر کر رہ گئیں۔ بیٹے سے کس طرح کہیں کہ میری رضا تو یہ ہے کہ میری بھانجیوں میں سے کسی کا انتخاب کر لو۔ انہوں نے زندگی میں کبھی بھی بیٹوں پر اپنی پسند ناپسند تھوپنے کی کوشش نہ کی تھی۔ باپ کی جانب سے ہونے والی زیادتیوں کی حلافی وہ اپنے طور پر کرنے کی ہر ممکن سعی کیا کرتی تھیں۔  
”اچھا امی! میں چلتا ہوں۔“ انہوں نے اٹھ کر بریف کیس اٹھایا۔ ”اللہ حافظ۔“

خدا کی امان میں سونپا۔“

وہ جواب تک چپکا بیٹھا بظاہر ناشتا کرنے میں مگن تھا، بھائی کے جاتے ہی اشارت ہوا۔  
”غور فرمایا آپ نے! بھائی جان اپنے طور پر پورا رشتہ طے بھی کر چکے ہیں۔ فرما رہے تھے۔ میں اپنے طور پر تحقیق کروا چکا ہوں۔ امی حضور، اب ہمیں اپنے اپنے طور پر تحقیقات کروانی چاہئیں کہ بھائی جان نے انہیں سب سے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ وہ کس رنگ کے لباس میں تھیں اور کس حد تک خوبصورت لگ رہی تھیں جو بھائی جان جیسا ذوق نظر سے عاری شخص بھی متاثر ہوئے ہوتا نہ رہ سکا۔ یکا یک ان کی تمام حیات لیلیہ جاگ اٹھیں۔“



”خدا کے لیے شہروز۔“ وہ عاجز ہوئیں۔ ”کچھ تو بڑے چھوٹے کا لحاظ کیا کرو۔“  
 ”اگر ہم سے چھوٹا کوئی ہوتا امی حضور تو آپ کو یقیناً اندازہ ہوتا کہ ہم اپنے بڑوں کا کتنا لحاظ کرتے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ مگر صد افسوس ہم سے چھوٹا کوئی ہے ہی نہیں جسے ہم اپنی بات پر گواہ کے طور پر پیش کر سکیں۔ خیر خیر۔ یہ تو ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ یہ فرمائیے کہ میرے خلاف یہ سازش صرف آپ نے تیار کی ہے یا اس میں جتنا بیاری راج دلاری کا بھی کچھ حصہ ہے۔“

”تمہاری بات کا سرچر ڈھونڈنے نکلے تو شاید برسوں لگ جائیں اور کوئی سراہا تھ نہ آئے۔“  
 ”یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ سر اور پیر دونوں ایک ساتھ ڈھونڈنے نکلتی ہیں۔ اب کوئی بتائے کہ یہ دونوں انتہائی متضاد اشیاء بیک وقت کس مقام پر ناموجود پر دستیاب ہوں گی؟ جیسی تو کوئی سرا آپ کے ہاتھ نہیں آ پاتا۔“  
 وہ مزے سے توس پر کھن لگانے لگا۔

”خیر! مدعا ہمارا یہ تھا کہ ہمیں دو عدد لڑکیوں کا سر پرست بنا کر آپ دوسرے شہر روانہ کر رہی ہیں۔ اور ہمارے پیچھے بھائی جان کی منگنی کر دینے کا پروگرام بنائے جیسی ہیں۔ یہ سازش نہیں تو اور کیا ہے امی حضور! ویسے پس پردہ جو مقاصد کار فرما ہیں ہم ان سے بخوبی واقف ہیں۔“  
 ”کون سے مقاصد؟ کس کے پس پردہ؟“ انہوں نے گھورا۔

”اسی سازش نما پروگرام یا پروگرام نما سازش کے پس پردہ!“ وہ نہایت مدبرانہ انداز میں مسکرایا۔  
 ہوتا ہے ناں گھروں میں، رواج سا چل نکلا ہے کہ لوگ لڑکیوں کا رشتہ کرنے آتے ہیں تو چھوٹیوں پر زیادہ غور کرتے ہیں۔ اسی لیے اکثر لوگ کسی رشتے کے سلسلے میں آنے والی خواتین کی آمد سے قبل ہی سولہ سترہ سالہ کے پس منظر عام سے غائب ہو کر پچیس چھبیس سال کے پس سامنے رکھتے ہیں۔ یہی مقصد آپ کا ہے لڑکی والے کہیں مجھ پر فریفتہ نہ ہو جائیں۔ اسی خوف کے پیش نظر آپ نے پہلے ہی سے مناسب بندوبست کر لیا ہے۔“  
 ”لاحول ولا قوۃ۔“ انہیں ہنسی آگئی۔ شہروز! کیا بلا ہو تم۔ میں کون سی منگنی کر رہی ہوں تمہاری غیر موجودگی میں بس لڑکی والوں سے ایک بار مل کر آ جاؤں گی۔ کوئی رسم انجام دی گئی تو انشاء اللہ سب کی موجودگی میں ہی کی جائے گی۔“

”ہوں!“ اس نے سر ہلایا۔ ”مناسب خیال ہے بلکہ بے حد عمدہ! ہم تو رسم و رواج کے بے حد خلاف ہیں امی حضور! لیکن پھر بھی جب کبھی اس گھر میں کسی رسم کے انجام دیے جانے کی بات ہوتی ہے ہمارے من میں پانی بھر آتا ہے۔ ہمارا خیال ہے، اس گھر میں آخری رسم جو انجام دی گئی وہ آپ کی تقریب نکاح کی تھی، جس میں چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہم شریک نہ ہو پائے تھے۔ ہم ٹھیک فرما رہے ہیں ناں؟“  
 عفت خانم مسکرا دیں۔

”سن رہی ہو جتنا!“ انہوں نے گرم چائے لاتی جتنا کو مخاطب کیا۔ ”کون سی بیڑی لگائی ہے خدا نے اس لڑکے کی زبان میں جو اس کی بے سرو پا باتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔“  
 ”مت ٹوکا کرو باجی۔“ جتنا نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ ہمارے بچے کی باتوں سے ہی تو اس گھر کی رونق ہے۔“

وہ بڑی معصومیت سے آنکھیں پٹپٹانے لگا تھا۔

جرنل مکمل کرتے ہوئے اس نے نظر اٹھائی تھی۔



غزالہ دونوں گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے کسی کھری سوچ میں تھی۔  
 ”معلوم بھی ہے انگرام میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔“ وہ پھر جیل کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔  
 ”مرا تھے شمع کر کے کچھ ارتکاز پڑھائی پڑ کرو۔ شاید بہتری کی کچھ صورت نکل آئے۔ ورنہ مجھے تو پورا یقین ہے کہ تم  
 جیل ہو جاؤ گی۔“  
 ”بھاڑ میں جانے پڑھائی۔“ وہ ہچکچلا کر بولی۔ ”میری جان پر مٹی ہے اور اماں صحت کو کوئی اور کام  
 ہی نہیں۔“

”کون سا بھاڑ ٹوٹ پڑا۔؟“  
 ”اب کس کیا رہ گئی ہے بھاڑ ٹوٹنے میں مجھے کو ان حضرت کی والدہ ہمارے ہاں تشریف لاری ہیں۔  
 بات بچی ہو جانے کی۔“  
 ”تو ہونے دو ناں۔ اس نے ٹین بند کیا۔“ مجھے تو یہ رشتہ ہر لحاظ سے عمل اور بہترین لگتا ہے۔“  
 ”تو تم کر لوں ناں۔“ اس نے دائیں لپکھ پائے۔  
 ”اگر بس میں ہوتا تو میں ٹیلی۔ بچو یا سریم کی نہ کروادیتی۔“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔  
 ”ریشم۔ ریشم۔ کچھ کرو۔“ وہ پھر پریشان ہوئی۔  
 ”مثلاً کیا؟“

”میں سر جاؤں گی اس کے بغیر۔“ وہ روہائی ہوئی۔ ”وہ بھی جی نہ پائے گا۔“  
 ریشم کو ہنسی آ گئی۔  
 ”بس تو پھر حل شدہ مسئلہ ہے۔ عالم بالا پر دونوں لوسنگز لگاتے پھرنا۔ نہ کوئی پابندی ہوگی نہ خوف۔“  
 ”نہانے میری قسمت میں کیا لکھا تھا جو تم سی دوست ملی ہے۔ محال ہے جو کوئی غلطی نہ مشورہ ہی دے  
 دے۔ احمق اور بدحوہ۔“  
 ریشم کا اندھے اچکا کر رہ گئی۔

”مجھے تو فی الوقت ڈیٹا میں صرف اور صرف ایک ہی مسئلہ نظر آتا ہے انگرام جو سر پر کھڑے ہیں  
 اور مطلوبہ تیاری عمل نہیں۔ میں تو دن رات پڑھتی رہتی ہوں۔ ٹیلی بچو کہتی ہیں ابھی ہیر لاؤ گی تو یونیورسٹی میں  
 داخلہ ملے گا۔“

”جی کرتا ہے اس کے ساتھ بھاگ جاؤں۔“ وہ اپنے مسئلے میں ابھی ہوئی تھی۔  
 ”ہائیں ا۔“ ریشم بوکھلا گئی۔ ”کیا حماقت ہے۔ دیکھو غزالہ، سریم کہتی ہے۔ اگر وہ لڑکا تم سے سر بس  
 ہوتا تو اب تک اپنے ماں باپ کو تنہا رہے کمر بیچ چکا ہوتا۔ وہ تو کھس وقت گزارا چاہتا ہے۔ جس قدر جلدی  
 تمہاری کہیں اور بات ملے ہو جائے، تمہارے حق میں اتنا ہی بہتر ہے۔“

”سریم کیا جانے ہماری مجبور یوں کو۔“ وہ جیل کر بولی۔  
 ”جب اس قدر مجبوریاں ہیں تو پھر علیحدہ تو ہونا ہی ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”آج یا کل۔“  
 ”جسٹ کسی سے عشق ہوا تو پھر پوچھوں گی۔“  
 ”نہ مانا اہم تو یہ روک پالنے والے ہی نہیں ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”یہ مہرت ناک مناظر ہی اس  
 عشق سے دل بڑا کرنے کے لیے کافی ہیں۔“  
 ”کہاں جیل دیں؟“  
 ”لاہور ہی۔ چلو مل کر پڑھیں گے۔“



”میری جانی ہے جوتی۔ میں تو کسی طرح کالج سے نکلنے کے چکر میں ہوں۔ ایک تو یہ چپا کی اور چوکیدار بڑی نگاہ رکھتے گئے ہیں۔“

ریشم کو اس کی جھنجھلاہٹ پر ہنسی آگئی۔  
وہ کیا کہہ گئے ہیں شاعر صاحب

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوبے کے جانا ہے  
اب دیکھو، پار اترتی ہو کہ نہیں۔  
وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

کھڑی میں دقت دیکھ کر اس نے اپنی نشست چھوڑی تھی۔  
بیک میں چیزیں رکھ کر چادر درست کرتی وہ باہر نکلے۔  
”ہیلو۔“

”وائس جاب سے آتی آواز یقیناً اس کے لیے تھی۔ وہ رُکنے پر مجبور ہوئی۔  
زارا انگلی میں رنگ کھاتی، مسکراتی ہوئی اس کی جاب بڑھ رہی تھی۔  
کہاں رہتی ہو؟ چلو آج میں چھوڑ دوں۔“

”جی نہیں شکریہ۔ مجھے آنے جانے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔“ اس نے حتی الامکان نرمی سے کہا۔  
”افوہ۔ تکلف کیسا۔ گاڑی میں بہت آرام سے گھر پہنچ جاؤ گی۔“  
”مہربانی۔“ وہ ذرا سا مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔

”عجیب لڑکی ہو بھی تم تو۔ یوں کتراتے ہو جیسے میں کوئی لوفر لڑکا ہوں۔ بھگا کر نہیں لے جاؤں گی تمہیں۔“  
”دیکھیں مس زارا“ وہ رُک گئی۔ ”بات مختص اتنی سی ہے کہ میں ایک عام شکل و صورت کی، عامی  
صلاحیتیں رکھنے والی لڑکی ہوں۔ میں خود جانتی ہوں کہ مجھ میں ایسی کوئی خاص بات نہیں جو کسی کو میری جاب چھوڑ  
کرے۔ ایسے میں جب کوئی مجھ سے بے وجہ قریب آنا چاہیے تو میں سخت کوفت میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ بھلا آپ  
کیوں چاہتی ہیں کہ میں کوفت میں مبتلا ہوں۔“

”عام سی شکل و صورت۔ عام سی صلاحیتیں۔“ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ ”جو لوگ خود سے واقف  
نہیں ہوتے نیلم! بہت نقصان اٹھاتے ہیں۔ خود سے واقف رہو۔“  
وہ کی رنگ کھاتی آگے بڑھ گئی تھی۔  
”نیلم بھی سر جھٹک کر اپنے راستے پر ہوئی۔

وین نے اسے اسٹاپ پر اتارا تھا۔ حسب معمول اس نے اتر کر چادر درست کی پھر آگے بڑھنے لگی۔  
قدموں نے جیسے اٹھنے سے انکار کر دیا۔  
بالکل سامنے، برگد کے پیڑ تلے یوسف اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ موجود تھے۔ اسے دیکھ کر وہ آہستہ  
آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب آگئے۔

”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں نیلی۔“  
”میں نیلی نامی کسی لڑکی کو نہیں جانتی اور مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔“ وہ آگے بڑھنے لگی۔  
”نیلم پلیز! تمہیں سننا ہو گا میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ دراصل تمہارے گھر میں تمہیں مخاطب کرنا اور کہنا  
کہنا مجھے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اور پھر یہ ذرا طویل گفتگو ہوگی۔“



”یوسف صاحب! کیا آپ نہیں جانتے میرے اور آپ کے مابین کیا رشتہ ہے؟“  
اس کے حوصلے جواب دینے لگے۔ مٹی میں آیا سچ سڑک پر چھ جگہ کر نہیں بے نقطہ سناؤالے۔ لیکن ایسا تو وہ رجب کے ساتھ بھی نہیں کر پاتی تھی۔ مصلحت کی چادر اوڑھے دیکھی آواز میں بولی۔  
”کیوں مجھے تماشا بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں آپ؟ کیا آپ جانتے ہیں آپ کا جو طرز عمل ہے اس کے کس قدر خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟“  
”تمہارا جو جی چاہے کہتا۔ لیکن میرے ساتھ چلو۔ پلیز۔“

اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔ اسے تو واقعی ان سے بہت کچھ کہنا ہے۔ انہیں خدا کا واسطہ دے کر اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے التجا کرنی تھی۔ ان سے کہنا تھا کہ وہ اپنی ماں بہنوں کی نظروں میں رسوا ہوئی جا رہی ہے۔  
”کہاں چلیں گے؟“

”کسی ایسی جگہ جہاں آرام سے بیٹھ کر باتیں کر لیں۔“  
”چلیں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ”لیکن صرف آدھے گھنٹے میں آپ مجھے واپس یہاں پہنچا دیں گے۔“  
”منظور ہے۔“ وہ کھل اٹھے۔

ویٹر کو کافی لانے کو کہہ کر وہ تمام حسیات کے ساتھ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔  
”اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہو۔“

”آپ کو کیا کہنا ہے یوسف۔ جلد کہیں۔ پھر مجھے بھی اپنی بات کرنی ہے۔“  
”نیل! مجھے تو صرف اتنا کہنا ہے کہ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔ میں نہیں رہ سکتا۔ نہیں رہ سکتا اس طرح سے۔ یہ نفلی زندگی گزارنا، ہل ہل جینا، ہل ہل مرنا میرے لیے ممکن نہیں۔“  
”یہ ہے وہ فضول اور حد درجہ وامیات بات، جس کے لیے آپ مجھے یہاں تک لائے ہیں۔ یوسف صاحب! زندگی آپ کے نزدیک محض ایک کھیل ہے جسے آپ اپنی مرضی سے کھیلتا چاہتے ہیں۔ جب مات ہوتی دیکھتے ہیں تو بسا اٹ کر پھر نئے سرے سے مہرے سجالتے ہیں اور پھر جیتنا چاہتے ہیں۔ لیکن دوسرے لوگ آپ کی بساط پر بے مہرے نہیں ہیں۔ جیتی جاگتی ہستیاں ہیں جو سانس لیتی ہیں، محسوس کرتی ہیں اور از خود حرکت کرتی ہیں۔“

اس کا سانس پھول گیا اور چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا۔  
”نیل! وہ اچانک اس کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ خدا را مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“  
”یہ..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔“ وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔

اس کے پاؤں تھامے وہ اس کے گھٹنوں پر سر رکھے بول رہے تھے۔  
”میں ہار چکا ہوں نیلی! ہر بازی ہار چکا ہوں۔ اپنی شکست تسلیم کر لی ہے میں نے۔ اب مجھے سناؤ گئی سزا میں ترمیم کرلو۔ خدا کے واسطے، مجھ پر ترس کھاؤ۔“

”نیلیم جیسے، برف کی بن گئی تھی۔ اس کا جسم بالکل سرد ہو گیا اور وہ لرزنے لگی۔ یوسف کا اس درجہ قرب اسے پاگل کے دے رہا تھا۔

”میں شبنم کو چھوڑ دوں گا نیلی۔ تمہاری قسم! میں نے اسے چھوا تک نہیں ہے۔ وہ بالکل پاک ہے۔ بس تم ایک مرتبہ ہاں کہہ دو۔ میں سب کو منالوں گا۔ میں سب کچھ درست کر لوں گا۔ تم ابھی شادی کرنا نہیں چاہتیں نا۔ میں ساری عمر تمہارا انتظار کر لوں گا۔ بس ہاں کہہ دو۔ کہہ دو نیلی۔“  
اس کی کیفیات لمحہ بھر میں بدل گئی تھیں۔ شبنم کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس جان لیوا حقیقت کے



انکشاف کے بعد وہ سناٹے میں آگئی تھی۔ اس کی بہن اس کی اپنی وجہ سے کتنی تکلیف دہ زندگی گزار رہی تھی۔ مہر طلب تھی۔

”دور نہیں۔ اور میری بات سنیں۔“ اس نے انہیں بری طرح جھٹکا۔  
 ”میری بہن کے ساتھ مزید کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے یوسف! بہت دوا ہے آپ کو مجھ سے کہیں  
 کا، تو قسم ہے آپ کو اس محبت کی۔ اسے اس کا جائز حق دیں۔ اسے بیمار دیں۔ اپنی چاہت کا یقین لے لیں۔  
 دیں۔ اور اگر آپ نے یہ سب کچھ نہیں کیا تو میں سمجھوں گی کہ آپ ایک ذہنی مریض ہیں اور اپنی ذہنی بیماری کو  
 کہتے ہیں۔ میں تو کیا خدا بھی اس زیادتی اور حق تلفی پر آپ کو معاف نہیں کرے گا۔ دنیا تو خراب ہوتی ہی ہے۔  
 اپنی عاقبت تو سنوار لیں۔“

اپنی بات ختم کر کے وہ ویٹر اور یوسف دونوں کو ہونق چھوڑ کر باہر نکل آئی۔  
 ”نیلیم۔“ وہ چند لمحوں میں اس تک آ پہنچے تھے۔ ”میری بات ادھوری چھوڑ کر جارہی ہو۔“  
 ”مگر میری بات مکمل ہو چکی ہے۔“ ان کا لہجہ ٹوٹا ہوا اور شکست خوردہ تھا۔  
 وہ خاموشی سے ان کے پیچھے بیٹھ گئی اور موٹر سائیکل آگے بڑھ گئی۔  
 ”کیا ہوا۔ کیوں پتھر کی بن گئی ہو۔“  
 ثریا نے شبہ کو ٹھوکا دیا۔  
 ”میں کہہ رہی ہوں یہ نیل دیکھو۔ اس سوٹ پر اچھی لگے گی ناں۔“  
 ”ہوں!“

وہ محض ہنکارا بھر پائی تھی۔ کتنے دنوں کے بعد آج ثریا کے بے حد اصرار پر اس کے ہاتھ کچھ چھوڑنے  
 کے لیے چلی آئی تھی اور نظروں نے ایسا منظر دیکھا تھا جس کے بعد وہ دنیا میں مزید کچھ بھی دیکھنے کی خواہش محض  
 رہی تھی۔

سڑک پار کرتے ہوئے ثریا اس کا ہاتھ تھام کر اپنی جانب نہ کھینچ لیتی تو یقیناً وہ ٹرک کے نیچے آجاتی۔

وہ شہروز کے کمرے میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دیوار گیر کلاک میں ساڑھے دس کا وقت ہوا تھا۔  
 ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے شہروز۔“ وہ منمنائی۔ ”میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“  
 ”آپ تو مجھ سے زیادہ بزدل ہیں صبا۔؟ ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے لیکن میں آپ کے گھر جانا نہیں چاہتی۔“  
 صبا ہنسنا چاہتی تھی لیکن محض لب ہلا کر رہ گئی۔  
 ”زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے امی سے جھوٹ بولا ہے۔“ وہ تاسف کا شکار تھی۔  
 ”چلیں۔ شادی کے بعد معافی مانگ لیجیے گا۔“

”شادی کے بعد؟“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔  
 ”فیروز بھائی سے شادی ہونے کے بعد۔“ اس نے وضاحت کی۔  
 ”کس قدر بد تمیز ہو تم۔“ اس نے آنکھیں نکالیں۔  
 ”کیوں؟۔ جو کچھ آپ کے دل میں ہے، اسے اپنی زبان پر لانا بد تمیزی ہے۔ اگر ایسا ہے تو

معذرت خواہ ہوں۔“ اس نے کندھے اچکائے۔  
 صبا کو اندازہ ہوا۔ وہ خود بھی قدرے نروس تھا۔ لیکن بول بول کر اپنی گھبراہٹ کو مخفی رکھنا چاہتا تھا۔  
 آج اس نے ایسا کام کیا تھا جو اگر منظر عام پر آ جاتا تو اسے سب بڑوں سے سخت ستارہ لگتا۔



اسے سب کی انہروں سے بچا کر اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ پلان کے مطابق گیارہ بجے جب حسب معمول فیروز خان کے لیے لان میں جانا تو مہیا بھی اس کے پیچھے جاتی اور اس سے حال دل کہہ ڈالتی۔ مہیا، نجمہ بیگم سے ذلیلہ اور عقیلہ سے ملنے اور دیر تک ساتھ بیٹھنے کی اجازت لے آئی تھی۔ کیونکہ کل وہ دونوں واپس جا رہی تھیں۔ اور ان سے مل کر اور گھر جانے کی اجازت لے کر وہ شہرہز کے پاس آگئی تھی۔

”ویسے یہ ٹھیک نہیں ہے شہرہز۔“ اسے ہر ایک منٹ کے بعد الجھن ہو رہی تھی۔

”خدا را مہیا! اب جو ہوگا سو ہوگا۔ مجھے تو نہ پریشان کریں۔“

”اگر حربہ پانچ منٹ بعد وہ لان میں نہ آئے تو میں گھر چلی جاؤں گی۔“

”فیروز بھائی۔ اپنے روٹمن کے از حد پابند ہیں۔“ وہ بولا۔

”وہ بے چینی سے نیچے لان میں کھٹنے والی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔“

\*\*\*

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک اٹھا۔

”بس۔“ اس نے ہولے سے کہا تھا۔

دروازہ کھلا اور ذلیلہ کا چہرہ برآمد ہوا۔

”میں اندر آ سکتی ہوں؟“

”فیروز احمد نے قدرے الجھن کے عالم میں کھڑکی کی سمت دیکھا۔

”آئیے۔“ وہ جیسے بادل خواستہ بولا تھا۔

اجازت مل جانے پر بھی وہ کچھ دیر دروازے میں ہی کھڑی رہی جیسے جو کچھ کہنے آئی ہو اسے ذہن میں یکجا کر کے دہرا رہی ہو۔

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“ وہ ہنوز الجھن کا شکار تھا۔

”اتنی لمبائیوں کی بے وقوفانہ حرکتیں اسے بہت جلد جھنجھلاہٹ کا شکار کر دیا کرتی تھی۔

”کی۔“ وہ آہستہ آہستہ چلتی اندر آگئی۔

”بیٹھیں۔“

وہ پہلے چنگ کے کنارے پرنگی پھر جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

”کیا بات ہے ذلیلہ؟“ اس کے لہجے میں برہمی درآئی۔

”وہ۔ دراصل۔ میں اور عقیلہ کل واپس جا رہے ہیں۔“ وہ اس کے انداز سے گھبرا گئی۔

”کی میں جانتا ہوں۔ صبح میں خود بھی آپ کو الوداع کہتا۔ اتنے میوز تو مجھے آتے ہیں۔“

”میرا مقصد یہ نہیں تھا۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”دراصل۔ میں کچھ اور۔“

”آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں؟“ وہ سر اپا سوال بن گیا۔

”کی۔ کی ہاں۔“

”تو جلدی کیجیے۔“ اس نے پھر کھڑکی پر نگاہ ڈالی۔

”میں۔ فیروز صاحب! میں کل جا تو رہی ہوں لیکن اس گھر کے دروازے پر مجھے مزاح ہو چکے ہیں۔ کیا کیا نہیں ہو سکتا کہ میں پھر۔ بیچے کے لیے یہاں آ جاؤں اگر آپ چاہیں تو۔“

اس کی انہروں جنگ گئیں۔

”وہ چند لمبے برہمی سے اسے دیکھتا رہا۔“



”میں نے پہلے بھی کہا تھا نبیلہ! بعض کنویں اندھے، اندھیرے اور خشک ہوتے ہیں لیکن آپ کی بات میں میری بات نہیں آئی۔“

”سچے جذبوں کی طاقت صحرا میں بھی پھول کھلا دیتی ہے۔“  
 ”ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ پھول سے بھرے دامن کی خواہش صحرا کی مٹی میں بھی کہیں موجود ہو۔“  
 ”مجھ میں کیا کمی ہے؟“ اس کی آنکھیں اس کے درشت انداز سے ڈنڈھا گئیں۔  
 ”اب سے کچھ دیر پہلے تک نہیں تھی۔“

”اور اب؟“ وہ ہنسنے لگی۔

”وہ بہت سے لفظ جو کچھ دیر پہلے تک صرف آپ کے تھے۔ فضاؤں میں بکھرے اور آپ کے سر پر رہے۔ سماعتیں اگر لفظ قبول کرنے سے انکار کریں تو کہنے والا بہت کچھ کھود جاتا ہے۔ یہ کیا کم نقصان ہے؟“  
 ”میں آپ کو وہ مقام نہیں دے سکتا جو آپ چاہتی ہیں۔“  
 اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ کمرے کھل گیا تھا اور ڈگر کھاتے قدموں سے اپنے کمرے کو بھائی نبیلہ اور ندامت اور فکرت سے سوچ رہی تھی کہ درحقیقت اسے نقصان ہی ہوا تھا۔

اور وہ جلتے جلتے دماغ کے ساتھ ان میں ٹھیلے ہوئے اسی سوچ میں تھا کہ جذبوں کو پھیلانے والے دل کیا اس دنیا میں ہوتے ہی نہیں ہیں؟۔ ہر بات کا اظہار زبان سے کر کے اس کی قدر و قیمت گننا کیا ضروری عمل ہے۔ کیا اس کے بغیر رو میں شانت نہیں ہو پاتیں۔

”ٹھیلے ٹھیلے وہ اچانک مڑا تو حیرت سے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس کے عین مقابل مہا سوچ تھی۔  
 ”مہا آپ!“ وہ شاک کی سی کیفیت میں تھا۔“ اس نے تھوک اٹھا۔

”اور نبیلہ نے اسے کیا ہوا۔ وہ اپنے آپ میں نہ رہا۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر انکارے پھڑپھڑا۔  
 ”خبردار۔ جو تم نے خود کو بے قیمت کیا۔ جو اپنی قیمت لگائے اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ سمجھو۔“  
 تیز تیز قدم اٹھاتا وہ اندر کی سمت بڑھ گیا۔ مہا گال پر ہاتھ رکھے، روانی سے ہتے آنسوؤں کے رات گیسٹ کی سمت دوڑی تھی۔

”بھائی۔ بھائی!“

”کھڑکی سے سارا منظر دیکھتا شہر و زہرہ وہ تمام کر بیٹھے رو دیا۔  
 ”یہ کیا کر رہا تم نے خوشیاں بڑھی تھیں تمہاری سمت، زندگی مسکراتی ہوئی آئی تھی۔ اور تم نے اسے لوہے سے دامن جھٹک دیا۔ بھائی۔ تم نے ہمیشہ کے لیے خوشیاں اپنی دسترس سے دور کر دیں۔“

\*\*\*

”شام تک لوٹ بھی آئیں گے شبنم خدمت کرو۔“  
 ”نہی تو میں تم سے کہہ رہی ہوں شریا۔ خدمت کرو۔ میں کہیں آئے جانے کے موا میں نہیں ہوں۔“  
 وہ بے حد آکٹا ہٹ سے گویا ہوئی تھی۔

”کتنے دلوں سے آئے۔ بھائی کہلواری ہیں۔ آج پروگرام بنا ہے تو تم غرے دکھا رہی ہو۔“  
 ”شریہ! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ مجھے حرج ہے۔“  
 ”کو۔“ اس نے جی جگ ہاتھ جوڑ دیے۔

”غضب خدا کا اہم تو بالکل پاگل ہو۔“ وہ اس کی حرکت پر ہلکے اٹھی۔ ”تمہاری مرضی ہے۔“  
 اس لیے کہہ رہی تھی کہ باہر لکھو گی، کہیں آؤ جاؤ گی تو طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا۔ پھر افریقہ میں ہو جائے گا۔ کہنا



”مجھے ایسے ہی رہنے دو۔“ وہ دل شکستگی سے بولی۔

”اپنی اماں کے گھر ہو آؤ۔ تم نے تو وہاں بھی نہ جانے کی قسم اٹھالی ہے۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ درحقیقت اماں سے ملنے اور ان سے لپٹ کر جی بھر کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ غم کی وجہ سے وہاں بھی نہیں جاتی تھی۔  
”اکیلی رہو گی بلا بیب۔“

ٹریا جاتے جاتے بری طرح جھنجھلا رہی تھی۔ چچی جان بھی کہا نہ ماننے پر خفا خفا سی تھیں۔ اس پر ایک اپنی نگاہ ڈال کر فکھل گئیں۔

”کیٹ ابھی طرح بند کر لینا۔“ پولس بھائی نے اسے ہدایت کی۔ ”ہم شام ڈھلنے سے پہلے ہی لوٹ آئیں گے۔“  
”جی بھڑ۔“

”کیٹ بند کر کے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کی زندگی نے اچانک وہ رخ اختیار کیا تھا کہ جس کا اس کے ذہن میں دور دور تک کوئی تصور ہی نہ تھا۔ یوسف سے شادی سے لے کر اب تک کے واقعات اس کے دل و دماغ پر کوڑے برساتے، مجروح کرتے، یکے بعد دیگرے گزرتے چلے جاتے تھے۔ اور بظاہر ان کے نکلنے کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔

نجانے ابھی اسے اپنی جان پر اور کتنے ستم برداشت کرنے تھے۔ ان کی قوت حوصلہ جواب دینے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد اور مصروف کیا ہونا چاہیے؟ اس کی قسمت میں خدا نے جتنی سانسیں لکھی تھیں، وہ تو اسے ہر حال میں پوری کرنی تھی لیکن کس طرح؟ بھاء کسی امید، کسی توقع اور کسی جذبے کے وہ یہ سانسیں کسی طرح اور کب تک پوری کرتی۔

اسے اپنے قلمی داماں ہونے کا احساس اس شدت سے ہو رہا تھا کہ اب ذہن کچھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں سے بھی عاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا بہت جلد وہ ایک مٹی کا بت بننے جا رہی تھی۔ جو اپنی موت پوری کرنے کے بعد کسی بھی لمحے ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں بکھر جاتا۔۔۔۔۔ کیونکہ ایک جیتی جاگتی ہستی کہلانے کے لیے جن جذباتوں، خواہشوں اور امیدوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے پاس بالکل نہ تھیں۔

خالق الٰہی کے عالم میں بیٹھی وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے ہوئے تھی جب اسے احساس ہوا کہ کال بیل بج رہی ہے۔ وہ ایک جھرجھری لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور گیٹ کھولنے چل دی۔  
”کیا مر گئے سب کے سب؟“ باہر یوسف کھڑے جھنجھلا رہے تھے۔ ”گھنٹہ بھر سے کمر ابلل بجا رہا ہوں، کوئی سنوائی ہی نہیں ہے۔“

وہ بنا کوئی جواب دینے پلٹ آئی۔ اس شخص کی صورت پر نظر پڑنے سے اس کے اندر گولے سے اچھے تھے۔ اس کی بے فکر ہستی مسکراتی زندگی میں کانٹے ہی کانٹے بچھا دیئے والا یہ شخص اس کی کسی شے کا حق دار نہ تھا۔ چند لمحوں کا بھی نہیں۔

”کہاں ہیں سب لوگ؟“ امی، ٹریا، پولس بھائی؟“ انہیں تشویش ہوئی۔

وہ جنور خاموشی اختیار کیے رہی۔

”کیا ہوا ہے؟“

”اس کے انداز غیر معمولی تھے اور گھر کے افراد بھی موجود نہ تھے۔ ان کی تشویش بجا تھی۔“



”شبّہم“ انہوں نے اسے جھجھکوا ڈالا۔

”مت ہاتھ لگائیں مجھے۔“

وہ اتنے زور سے چیختی تھی کہ وہ ڈر گئے۔

”مت ناپاک کیجئے مجھے۔ آپ کے آلودہ جسم سے گھن آتی ہے مجھے۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی حسرتوں کی تکمیل جائز رہتے کر ہی نہیں سکتے۔ جائیں، اپنی خواہشات کہیں اور جا کر پوری کر لیں۔ کسی اور سے بھیک مانگیں۔ کسی اور کے سامنے اپنا کاسہ پھیلائیں۔ پھر چاہے وہ کوئی بازاری عورت ہو، کوئی بدکردار بھکھان ہو یا میری اپنی بہن ہو۔“

”شبّہم!“ بات ان کی برداشت سے کہیں زیادہ تلخ تھی۔ انہوں نے اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ پھر اسے بستر پر پھینک کر باہر چلے گئے۔

”بزدل۔ بے غیرت، بے کردار، لادین۔“ وہ چیختی رہی۔ ”اور کر ہی کیا سکتے ہیں آپ، اور دے ہی کیا سکتے ہیں مجھے۔“

تکیے میں منہ دے کر وہ نجانے کب تک روتی رہی۔

کسی کے ہاتھ کالس اسے اپنے کاندھے پر محسوس ہوا تھا۔

”شبّہم!“ پھر کسی نے اسے بڑی محبت سے پکارا۔

وہ ایسے اچھلی جیسے بچھونے ڈنک مارا ہو۔

ریاض بھائی اس کے بے حد قریب بیٹھے تھے۔

”آپ؟“ اسے اپنے منتشر حواسوں کو یکجا کرنے میں ناکامی ہوئی۔

”شبّہم۔ کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو۔ یہ۔ یہ نشان کیسے ہیں تمہارے گالوں پر۔“

اتنا نرم لہجہ، ایسا مہربان انداز۔

”ریاض بھائی!“ وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

\*\*\*

”دھیرج دھیرج۔“ وہ اسے آہستہ آہستہ تھپک رہے تھے۔

”میں مر جانا چاہتی ہوں ریاض بھائی! میں زندہ رہ کر کیا کروں گی، کیا کر رہی ہوں؟ میرے لیے

اب زندگی میں کوئی کشش، کوئی امنگ باقی نہیں رہی۔ کوئی بہانا ہی نہیں رہا۔“

”ایسے نہیں کہتے شبّہم۔“

”میرا جی چاہتا ہے ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ اس کا تماشا دیکھوں، خوب تہقہ لگاؤں اور پھر خود بھی

اس آگ میں کود پڑوں۔ خود کو بھی مٹا ڈالوں اور زمانے کو بھی۔ نجانے خوشی کیا ہوتی ہے۔ کن لوگوں کو ملتی ہے کسی

شے کے عوض ملتی ہے۔ میں تو غموں کی بھٹی میں تپ تپ کر راکھ ہوئی جا رہی ہوں۔ اور سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ

اس بھٹی میں مجھے میرے اپنوں نے جھونکا ہے۔ جس سولی پر میرا زخمی وجود پھڑپھڑا رہا ہے اس تک میرے گئے

میرے پیارے مجھے کھینچتے ہوئے لائے ہیں۔ میری ماں جانی، جسے میں بہت بہت پیار کرتی تھی، جس کے پایزہ

چہرے پر قربان ہونے کا سوچتی تھی۔ اسی نے رات کے اندھیرے میں اپنے خوفناک نوکیلے دانت میری شرک

میں گاڑ دیے؟ کس جنم کا بدلہ لیا اس نے مجھ سے۔ میں نے کب اس کے آگے اپنا دامن پھیلا یا تھا جو اس نے اپنی

جھوٹی تھالی میرے سامنے رکھ دی۔ زیت گل و گلزار نہیں تھی تو اس قدر ویران بھی نہیں تھی۔ اس نے کیوں برا



اس کے حواس کی طور پر قابو میں نہ آ رہے تھے۔

”ہاں۔ ہاں ایک تپتا ہوا اجازت صحرا ہے وہ شخص میرے لیے۔ اس کا ساتھ لے کر میرے لیے خوشیوں کا کوئی پھول نہ کھلا سکا۔“ فطیسی جا رہی ہوں میں۔“

”حوصلہ کرو شبنم! جتنے کوڈنیا میں بہت کچھ ہے۔ خوشیاں کسی کی جاگیر نہیں ہیں۔ یہ تو کہیں سے بھی ل سکتی ہیں۔ تم ایک نظر اٹھا کر تو دیکھو، کس کس کے دل تمہارے آگے سرنگوں ہونے کو بے قرار ہیں۔ تمہارے قدموں میں گر کر ترپنا چاہتے ہیں۔ ان سے لپٹنا چاہتے ہیں۔“

وہ جیسے آہستہ آہستہ ہوش میں آنے لگی۔ ایک اجنبی لہجے کا احساس اسے بیمار کرنے لگا۔ کسما کسما نے ریاض بھائی کے بازو اپنے وجود سے الگ کرنے چاہے۔

”تم یوسف کی پروا اب تک کرتی ہو؟۔ ارے بھائو میں ڈالو اسے اور اس کے تصور کو بھی۔ جسے تمہارا خیال تک نہیں آتا تم اس کے غم میں اپنی آنکھیں خراب کر رہی ہو؟۔ ان آنکھوں کو چاہئے اور مر رہے والے مر گئے ہیں کیا؟۔“

ان کے بازوؤں کا گھیرا تنگ تر ہو جا رہا تھا۔

”ریاض بھائی۔“

”اسے پوری طرح سے احساس ہو گیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ تڑپ کر وہ ان سے الگ ہو گئی۔

”ارے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ کیا ہوا شبنو؟۔ ایسے بھلا کیوں گھبرا گئیں۔ میں کوئی غیر معمولی ہی ہوں۔ تمہارا اپنا ہوں۔ بالکل اپنا۔“

”وہ اپنی سوچتی ہوئی آنکھوں میں ناگواری کا احساس بھرے انہیں دیکھنے لگی۔

”کون کیس جانتا کہ یوسف میاں تمہارے ساتھ کس قدر زیادتی روا رکھے ہوئے ہیں۔ تم دونوں میاں بیوی کم اور دو اجنبی زیادہ لگتے ہو۔ جو ایک ساتھ سفر کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اور۔ اور۔ یہ نیلم کا کیا پتہ ہے؟۔ کیا یوسف اب تک اس کے خیالوں سے پیچھا نہیں چھڑا پائے؟“

”وہ بے بسی سے سر جھکا کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

”کیا قیامت کا زمانہ ہے۔“ انہوں نے ہنس سے سر ہلایا۔ ”اتنی اچھی۔ اتنی باری۔ اتنی مصہوم بیوی کے ہوتے ہوئے بھی انہیں باہر تا تک جھانک میں لطف آتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی گھر میں بجے پر لٹک خزان سے اٹھ کر دوسروں کے خالی پیالے چاٹتا پھرے۔ ساری خرابی نیت کی ہے۔ لیکن تم کیوں دل بے آگوش ہو۔ تمہیں بھلا کس شے کی کمی ہے؟۔ حسن و جمال کی دولت سے مالا مال ہو۔ ایسا سن سکاؤ کہ موصوف یاد رکھیں۔“

”میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ رندمی ہوئی آواز میں بولی۔

”کیا کر سکتی ہو؟“ وہ حیران ہوئے۔ ”کیا نہیں کر سکتیں؟ خیر کم از کم اتنا تو کر سکتی ہو کہ میں اتنا خون بہانے کے بجائے خوش رہوں۔ کھاؤ پیو، زندگی کے مزے لوٹو۔“

اس نے طنز یہ لگا ہوں سے انہیں دیکھا۔

”خوش رہنے کا کوئی نہ کوئی جواز ہوتا ہے ریاض بھائی۔ بے وجہ ہنسنے کی تو لوگ پتھری ماریں گے۔“

”کمال ہے۔“ بھئی جو کام بھی تمہیں خوشی بخش سکتا ہے، بے دھڑک کرو۔ دوسروں کی پروا کرنے والے فوجی تمہائیوں سے سر پھوڑ کر رو دیا کرتے ہیں۔ ہنسو، مسکراؤ، خوش رہو۔ اپنے چاہنے والوں کی پامت سے لطف اندوز ہو۔ یہی بہت ہے۔“

اس نے غور سے انہیں دیکھا۔

”ارے بھئی۔ کس کام سے آیا تھا اور کن باتوں میں وقت گزار گیا۔“ انہوں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”میں



تو نہیں لینے آیا تھا۔

”مجھے لینے؟“

”ہاں اور کیا۔ شریا اور امی جان وہاں پہنچیں تو آمنہ بہت خفا ہوئی تمہارے نہ آنے پر۔ میں اسے گھر میں ابھی جا کر لے آتا ہوں۔ یہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں، دروازہ چوہٹ کھلا ہے، پورا گھر خالی پڑھا ہے اور یہاں اوپری منزل میں اکیلی بیٹھی رو رہی ہو۔ ہوا کیا تھا؟“

”کچھ نہیں۔ اس نے نظریں چرا لیں۔“

”مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ یوسف میاں نے تم پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ تمہارے گال کس قدر سرخ رہے ہیں۔“

”وہ اور کربھی کیا سکتے ہیں۔“ وہ تنفر سے بولی۔

”چچ چچ، بیوی پر ہاتھ اٹھانا کس قدر نچلے درجے کے لوگوں کا کام ہے۔ چلو، تم اٹھ کر دھو اور کپڑے بدلو۔ ادھر سب لوگ کھانے پر انتظار کر رہے ہوں گے۔“

”میں نہیں جاؤں گی ریاض بھائی۔ پلیز، مجھے مجبور نہ کریں۔“

”کیسے نہ کریں بھئی؟ یوسف میاں کے دل میں تمہارا درد نہیں ہے تو کیا سبھی کو احساس سے انہ عاری سمجھتی ہو؟۔ میں تو ہرگز تمہیں یوں اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ نہیں چلتی تو میں بھی یہیں بیٹھا رہوں گا۔“

”ریاض بھائی! مجھے مجبور نہ کریں۔“

”چلو اٹھو۔ شاباش! اگر مجھے کچھ سمجھتی ہو تو فوراً اٹھ کر کپڑے بدلو۔ ارے ہاں، وہی نئی ساڑھی پہنو جو اس دن ہمارے ہاں دعوت میں پہن کر آئی تھیں۔ کیا قیامت ڈھائی ہو وہ پہن کر۔ شعلہ جوالہ لگتی ہو۔“

”وہ ناگواری کے جذبات چھپائی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ یوں بھی وہ اس کے قریب بہتر ہی بیٹھ ہوئے تھے اور اسے سخت اُجھڑا ہوا ہوا تھا۔“

”آپ نیچے چل کر بیٹھیں۔ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“

”اچھا اچھا۔“ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”زیادہ دیر نہ لگانا وہ لوگ پریشان ہوں گے۔“ اس نے الماری سے ایک سادا سا جوڑا نکالا اور ہاتھ روم میں کھس گئی۔

یوں تو اس سخت بے دلی کی کیفیت میں اس کا کہیں بھی آنے جانے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ نہیں چاہتی تھی کہ ریاض بھائی اس کے ساتھ تنہا گھر میں موجود رہیں۔ ان کی پیش رفت وہ خوب سمجھ رہی تھی۔ نجانے کیا بات تھی۔ اسے یہ سب کچھ اس حد تک برا نہیں لگ رہا تھا۔ جتنا کہ لگنا چاہیے تھا۔

کیلے بال سکھا کر اس نے پشت پر پھیلا دیے اور آنکھوں میں ہلکا سا کاجل ڈال کر نیچے اتر آئی۔

”چلیں ریاض بھائی۔“

”واہ۔ کیا روپ نکھر آیا ہے۔ کاجل کی ہلکی سی لکیر بھی مانو جادو کر ڈالتی ہے۔ دیے یہ اور بات ہے کہ تم نے ہماری خواہش کا احترام نہیں کیا۔“

”مجھے خود سے ساڑھی باندھنی نہیں آتی۔“ وہ ہولے سے مسکرا دی۔

”چلو معاف کیا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ”آؤ چلیں۔“

ان کی ہمراہی میں اسے گھر سے نکلتے ہوئے ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے وہ یوسف سے انتقام لے رہی ہو۔ اس کے اندر سکون سا، اترنے لگا۔

”بیٹا! کھانا لگا دیا ہے۔ آ کے کھاؤ۔“ جنانے کمرے میں جھانک کر اطلاع دی۔



”جہنا مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔ میں کچھ دیر بعد کھاؤں گا۔“

وہ کھانے کی میز پر نیلے کا سامنا کر رہی نہیں چاہتا تھا۔ آج وہ صبح سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ جو اسے لاحق تھی۔ سوچ سوچ کر اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ زندگی میں اسے کئی لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ اس نے کئی دل توڑے تھے۔ کتنے ہی کول جذلوں سے آنکھیں بند کر کے گزر گیا تھا لیکن وہ۔

وہ مختلف تھی۔ آج تک کمرانے والی ہر لڑکی سے مختلف نہانے کیوں اسے دیکھ کر زندگی اور زندگی کی ہر پہلی پر یقین کر لینے کو، فیروز احمد کا دل چاہا تھا۔ اس کی نرم روی، شانسی ہر رکھ رکھاؤ، انداز نگہ اور دھیرے دھیرے سے مسکرانے کی ادا خود پر اعتماد کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ شروع میں وہ اسے کچھ نہیں سکا تھا۔ شاید یہ اس کا حیا آئیز گریز تھا۔ جو کچھ بھی سمجھنے نہ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسے اپنی دانست میں شہروز سے منسوب کر بیٹھا اور اسے یہ جان کر بڑی خوشی بھی ہوئی تھی۔ اسے خوشی ہوئی تھی کہ اس کے جان سے عزیز بھائی کو ایک بہترین لڑکی ملی ہے۔ ورنہ اس کی لالہ بالی طبیعت اور خوشی سے وہ خوفزدہ رہتا تھا کہ کہیں وہ کوئی غلط انتخاب نہ کر بیٹھے۔ کبھی نقصان نہ اٹھائے۔ لیکن پھر اسے اس کول سی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر اس نے سکون کا سانس بھرا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ یکلفت اس پر یہ انکشاف از خود ہی ہو گیا کہ وہ جو کچھ اس نے سمجھا تھا، وہ بکسر غلط تھا۔ وہ سارے جذبے اور احساسات جن کا اسے ادراک ہوا تھا، موجود تو تھے لیکن شہروز کے لیے نہیں تھے اور کس کے لیے تھے، اس انکشاف نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ حیرت اسے اس بات پر ہوئی تھی کہ اسے غصہ نہیں آیا تھا۔ اس کا جی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کو نہیں چاہا تھا۔ اسے اس لڑکی سے نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اسے خوشی ہوئی تھی۔

ایک بے پایاں مسرت احساس اس کے اندر ابھرا تھا کہ دنیا میں کوئی ہستی ایسی بھی ہے جو محبت کرنا اور اسے انمول موتی کی طرح یہی میں قید رکھنے کا ہنر جانتی ہے۔ جو خوشبو کو محصور رکھنا جانتی ہے۔ جسے ہواؤں میں پھرے بٹھانے آتے تھے۔ جو اپنی نظروں پر حجاب کے پہرے لگا سکتی ہے۔ جسے الفاظ کی اہمیت کا اندازہ ہے کہ کس طرح یہ کسی کو کسی کی نگاہ میں معتبر کرتے ہیں اور کیسے کسی کو بے مول کر دیتے ہیں۔ اس کی نگاہ میں یکلفت وہ لڑکی بہت معتبر، بہت محترم ہو گئی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوتا اور وہ شہروز یا عفت خانم کے پاس بیٹھی نظر آتی تھی تو اس کے اندر خوشی کی ایک مدھم سی لہر دوڑ جاتی۔ فون کی بیل بجنے پر وہ ریسیور اٹھاتا اور دوسری جانب سے اس کی آواز سنائی دیتی تو وہ ریسیور کو بڑے احترام سے تھام لیتا۔ وہ اس کے لیے رفتہ رفتہ ایک مقدس شے بنتی جا رہی تھی جب اچانک وہ سب کچھ ہوا جس کا فیروز احمد تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صبا پر ہاتھ اٹھا بیٹھا۔

سوچتا تھا کہ اپنا ہاتھ کاٹ کر رکھ دینے کو جی چاہتا تھا۔

”نجانے کیوں میں اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ آخر کیوں؟“

اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ شاید حقیقت یہ تھی کہ نیلے نے اسے نہیں کر دیا تھا۔ وہ اسے جس طرح اپنے وجود کا احساس دلانے پر تل گئی تھی اس سے فیروز احمد کے لاشعور میں چھپی وحشت جاگنے لگتی تھی۔ اس پر دیوانگی سی طاری ہونے لگتی تھی۔ اور پھر اس کا اظہار واقعی اسے کچھ دیر کے لیے دیوانہ بنا گیا تھا۔ اسی حالت میں مہا اس کے سامنے آگئی اور اسے اپنے عتاب کا نشانہ بنا بیٹھا۔

”لیکن وہ۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔“ اس نے سوچا۔

”رات کے اس پہر وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ اس نے مجھے کیوں محاسب کیا تھا۔ کیا محبت سا انمول موتی



بچی کو بے چین کر رہا تھا؟ کیا وہ بوجھ اٹھاتے تھک چکی ہے؟۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، ہمیشہ ایسا ہی کیوں ہوتا ہے۔“

”اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسے گئے۔“

دروازے پر دستک ہوئی تو اس کی سلگتی ہوئی سوچوں کا سلسلہ موقوف ہوا۔

”کون ہے؟۔“ نجانے کیوں آواز حد درجے ٹھنڈی برآمد ہوئی تھی۔

”بھائی۔“ وہ اترے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر آیا تھا۔ ”ہم لوگ جا رہے ہیں۔ آکر مل لیجئے۔“

”چاہیں تو۔“

اپنی پریشان سوچوں سے اُلٹتے وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ اس نے شہروز کی یا سیت کو محسوس ہی نہیں کیا۔

”ہوں! تم چلو میں آتا ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد وہ اُٹھ کر ہاتھ روم میں کھس گیا۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔  
تولیے سے منہ خشک کیا اور انگلیوں سے بال سنوارتا ہوا باہر آ گیا۔  
دونوں لڑکیاں عفت خانم سے گلے مل رہی تھیں۔

”خدا کی امان میں سو نپا۔“ ان کا گلارندھ گیا تھا۔ ”پھر آتی رہنا بچیو۔ تمہارے دم سے ہی کچھ دنوں کے لیے بہاری آگئی تھی ورنہ تو۔“

”ہم پھر آئیں گے آنٹی۔“ عقیلہ خلوص سے بولی۔ ”آپ بھی آتی رہے گا۔ فون پر بھی رابطہ رکھیے گا۔“  
”انشاء اللہ۔“ انہوں نے آنکھیں پونچھیں۔ ”ماں کو میرا سلام دینا اور اگر مجھ سے کوئی شکایت ہو تو مجھے معاف۔“

”آنٹی!“ نبیلہ نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ ہماری بزرگ ہیں۔ ہم سے کچھ بھول چوک ہوئی ہو تو ہمیں آپ بچہ سمجھ کر معاف کر دیجیے گا۔“  
”تم تو بڑی پیاری بچیاں ہو۔ میرا دل اپنے ساتھ ہی لیے جا رہی ہو۔ کتنی عزیز ہو گئی تھیں توڑے ہی دنوں میں مجھے۔“

انہوں نے فیروز احمد کو دیکھا تھا۔ وہ نظر چرا کر رہ گیا۔  
”جلدی سے بہروز بھائی کے لیے کوئی لڑکی تلاش کر لیں پھر ہم شادی میں آئیں گے۔“ عقیلہ کہہ رہی تھی۔  
”انشاء اللہ۔“

ان سے مل کر وہ جمن سے ملیں۔

”خدا حفاظت سے پہنچائے۔“

”اس نے دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔“

”اپنی امی کو ہمارا سلام دیتا۔“

”اچھا فیروز صاحب!“ نبیلہ اس سے مخاطب تھی۔ ”زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ اگر قسمت میں ہو تو۔“

”ضرور۔ اللہ حافظ۔“ اس پر اس کی مخصوص سنجیدگی سوار تھی۔

”میرے بیٹے کو دیکھو۔“ عفت خانم نے پیار سے شہروز کو دیکھا۔ ”یہ نہیں ہو رہا کہ جاتے جاتے ہی

سے دو باتیں ہی کر لے۔ آج منہ میں چنے کیسے بھرے بیٹھے ہو؟“

وہ اُٹھ کر ماں کے گلے لگ گیا۔

”امی حضور۔ ہم سخت اداس ہیں۔ اگر وہاں ہمارا جی لگ گیا تو ہم مہینہ بھر بعد ہی آئیں گے۔“

”اور پیچھے ماں جو اداس ہو جائے گی اس کا کچھ خیال نہیں۔ تو ہی تو ماں کی اداسیوں اور تہانوں کا



ل دیا جائے۔ میرے گھر کی بلبل ہے۔  
 ساگی ہے۔ اسے پیار کر رہی تھیں۔

”نبیلہ اور عقیلہ ہنس دیں۔ فیروز خاموش کھڑا رہا۔ ماں آج جانے کیا کچھ سنار ہی تھیں۔  
 ”اچھا بھائی۔“ وہ اس تک آیا۔  
 ”اللہ حافظ۔“ فیروز نے اسے گلے لگا لیا۔

ان تینوں کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر ماں کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ سخت اداسی کے عالم میں کچھ سوچ رہی تھیں۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ ان سے کوئی بھی بات نہ کر سکا۔ اسے احساس ہوا وہ سب سے کتنا پیچھے رہ گیا تھا۔ اپنی ماں سے، اپنے سگے بھائیوں سے، اپنے دوستوں سے۔ ہر کوئی اسے ساتھ ساتھ چلنے کی نصیحت کرتا آگے نکل گیا تھا اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ کہیں ماضی میں زندہ تھا۔ اسی لیے اسے حال میں جیتے لوگوں سے بات کرنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ کسی بھی طرح پر اس کا کسی سے کوئی رابطہ نہ تھا۔  
 اذانوں کی آواز پر عفت خانم اٹھ کر اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئیں اور وہ جسمانی طور پر بھی وہاں تھا رہ گیا ہاں۔ جتنی طور پر وہ نجانے کب سے تنہا تھا۔

”لیکن کیوں۔“ اس نے سوچا۔ ”کیوں میں نے اپنے لیے خود پر سزا تجویز کی تھی۔ کس قصور کی پاداش میں خود کو ہمیشہ کی تنہائی، مستقل غذاؤں کے سپرد کیا تھا میں نے؟“ بھائی جان، مائی، شہروز۔ کتنے قریب ہیں ایک دوسرے کے اور میں کسی اور ڈبے میں سفر کرتے مسافر کی طرح الگ تھلک اپنے ڈکھوں اور سکھوں سے الگ ہوتا ہوں۔“

اسے لگا وہ تھپڑ اس نے صبا کو نہیں اپنے آپ کو مارا تھا۔ اس تھپڑ نے اسے جیسے کسی گہری زبرد سے جگا دیا تھا۔ وہ جاگ گیا تھا۔ ایک طویل عرصے کی زبرد سے بیدار ہوا تھا۔ رشتے، ماطوں سے کھلی بار خلاف ہو رہا تھا۔ اس کی اہمیت کا احساس اب آ رہا تھا۔

اسے لگا، اس نے زندگی کا ایک بڑا عرصہ ضائع کر دیا تھا۔ بہت کچھ کھو دیا تھا اس نے۔  
 ”کو چائے پیو۔“

وہ اپنے خیالوں سے چٹکا۔ جتنا چائے کی پیالی لیے کھڑی تھی۔  
 وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر چائے کی پیالی تھام لی۔  
 ”تھینک یو جیٹا۔“ وہ ممنونیت سے بولا تھا۔



گھٹے سیاہ سگی بالوں کو برش سے سنوارتے ہوئے اس نے اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ نیٹ کے سیاہ لباس نماں کا حسن چمکا پڑ رہا تھا۔ بے تحاشا گورے بازو، تنگ آستھیوں میں اپنی بھاری دکھا رہے تھے۔ کانوں میں ہنسے ہوئے کے چھوٹے چھوٹے ہائیس بالوں کی اوٹ میں کبھی کبھار جھانکتے اور اس کے چہرے کو حشر کر دیتے۔ گورے کے لاکٹ نے گہری، صراحی دار گردن کو حریہ جیسی نکال دیا تھا۔ گھرے گھرے ہوتوں کو اس نے لپ اسٹک سے شپے کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔

آئینہ کہہ رہا تھا کہ وہ بے حد حسین، بے حد جیتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے اوپر غریبوں کی جاسکتی تھیں۔  
 صدارتے پر بھی ایسی دستک ہوئی تو کھائی پر دست وارج ہاتھ اس کا ہاتھ تھم گیا۔  
 ”کھانا ہے؟ آ جاؤ۔“  
 ”صدارتہ کھانا اور سیاہ کوٹ چٹ میں ملیں صبحان اللہ آئیں۔“



اک دیا جلائے رکھا۔ میں نے ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔  
 ”اسلام علیکم۔“ ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔  
 ”وعلیکم۔“ اسے قدرے ناگواری ہوئی۔ ”آئیں۔ تشریف رکھیں۔“  
 ”آپ میرا استقبال یوں کرتی ہیں جیسے ہم اب تک ایک دوسرے کے لیے انتہائی ہوں۔“ وہ مسکرائے۔  
 ”مجھے بوجھ لگ رہا ہے۔“ اس نے یونہی بات چھیڑی۔  
 ”بہت زیادہ۔“ آج آپ پریشان کیے ہیں۔ جتنی طور پر تھکا ہوا ہوں۔ سوچا آپ کے ساتھ کئی ملا کر

آج ہی کافی بی بی جائے۔“  
 ”اوہ!“ وہ ہنست کیڑ کر رہی تھی۔

”کہیں کی تیار ہے؟“ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

”جی۔ جی ہاں!“ وہ کچھ سوچ کر بولی تھی۔

”یہ شام اگر میں آپ سے ملنے آتا ہوں تو؟“ وہ قدرے قہقہے سے مسکرائے۔

اس کا روپ ان کے دل میں اترا جا رہا تھا۔ شام کے ساتھ ساتھ ان کا دل اسے بھی مانگنے لگا۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ تذبذب سے بولی۔ ”دراصل کسی سے میری ملاقات ملے ہے۔ میں نہ تو

وعدہ ظانی ہوئی۔“

مطمان چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔ کسی سوچ میں کم وہ اپنا تجاہل اب کاٹنے لگے تھے۔

”الماس ان کی جانب سے کسی بات کی منتظر تھی۔“

”تو چھوٹا ہوں۔ یہ ملاقات کس سے ملے ہے؟“

ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔ وہ چونکے پر مجبور ہو گئی۔

”الماس! میں۔ میں جانتا چاہتا ہوں۔ سب کچھ! میں جانتا ہوں کہ اب اس کلمہ کی کیا کیفیت

بہر گل آؤں۔ کسی فیصلہ کن موڑ پر پہنچتا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ سے ایک بار کہا تھا الماس کہ میں ہاں

دراستیات کا قائل نہیں۔ نہ ہی بے وجہ شک و شبہ کا شکار ہوتا ہوں لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نقل یا

رات انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے اور ان کو جاننا اور سمجھنا انسان کا حق ہوتا ہے۔ بہت دُور سے حضرت زکرا

شاید آپ کچھ کہیں کی گئیں آپ۔ میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ لہذا اب مجھے خود ہی ہوجو ہونا

چاہیے کہ آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”میں کیا چاہتی ہوں۔“ وہ خود سے بولی۔ ”میں اس کی پروا کس کو ہے؟“

”کسی اور کو ہونہ ہو، مجھے ہے۔ مجھے آپ کی، آپ کے جذبات و احساسات کی بہت پروا ہے۔ آپ

بے فکر ہو کر مجھ سے سب کچھ کہہ ڈالیے۔“

”کیا کہوں۔ کیا سنتا چاہتے ہیں آپ؟“ وہ تذبذب کا شکار تھی۔

”یہ۔ رضا صاحب! بلا ہر سوالات بہت تکلیف دہ ہیں، نہ صرف آپ کے لیے بلکہ میرے اپنے لیے

ہی۔ لیکن اب یہ جانتا ضروری ہو چکا ہے۔ اس لیے میں اس طرح پر آ کر گفتگو کرنے پر مجبور ہوں۔ دراصل اب

ذوق بننا کسی کو بھی پسند نہیں ہوتا اور مجھے ہے کہ میں بے وقوف بن رہا ہوں۔“

”الماس! چند لمحے انہیں دیکھتی رہی۔ اسے لگا مٹان ٹھیک کہہ رہے تھے۔ فیصلہ کن موڑ پہنچا تھا۔

فیصلہ اسے ہی ملتا تھا۔

”مٹان!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ اچھا ہوا۔ آج آپ نے

ایک دیا جلائے رکھا۔“

”اسلام علیکم۔“ ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔

”وعلیکم۔“ اسے قدرے ناگواری ہوئی۔ ”آئیں۔ تشریف رکھیں۔“

”آپ میرا استقبال یوں کرتی ہیں جیسے ہم اب تک ایک دوسرے کے لیے انتہائی ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”مجھے بوجھ لگ رہا ہے۔“ اس نے یونہی بات چھیڑی۔

”بہت زیادہ۔“ آج آپ پریشان کیے ہیں۔ جتنی طور پر تھکا ہوا ہوں۔ سوچا آپ کے ساتھ کئی ملا کر

آج ہی کافی بی بی جائے۔“

”اوہ!“ وہ ہنست کیڑ کر رہی تھی۔

”کہیں کی تیار ہے؟“ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

”جی۔ جی ہاں!“ وہ کچھ سوچ کر بولی تھی۔

”یہ شام اگر میں آپ سے ملنے آتا ہوں تو؟“ وہ قدرے قہقہے سے مسکرائے۔

اس کا روپ ان کے دل میں اترا جا رہا تھا۔ شام کے ساتھ ساتھ ان کا دل اسے بھی مانگنے لگا۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ تذبذب سے بولی۔ ”دراصل کسی سے میری ملاقات ملے ہے۔ میں نہ تو

وعدہ ظانی ہوئی۔“

مطمان چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔ کسی سوچ میں کم وہ اپنا تجاہل اب کاٹنے لگے تھے۔

”الماس ان کی جانب سے کسی بات کی منتظر تھی۔“

”تو چھوٹا ہوں۔ یہ ملاقات کس سے ملے ہے؟“

ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔ وہ چونکے پر مجبور ہو گئی۔

”الماس! میں۔ میں جانتا چاہتا ہوں۔ سب کچھ! میں جانتا ہوں کہ اب اس کلمہ کی کیا کیفیت

بہر گل آؤں۔ کسی فیصلہ کن موڑ پر پہنچتا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ سے ایک بار کہا تھا الماس کہ میں ہاں

دراستیات کا قائل نہیں۔ نہ ہی بے وجہ شک و شبہ کا شکار ہوتا ہوں لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نقل یا

رات انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے اور ان کو جاننا اور سمجھنا انسان کا حق ہوتا ہے۔ بہت دُور سے حضرت زکرا

شاید آپ کچھ کہیں کی گئیں آپ۔ میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ لہذا اب مجھے خود ہی ہوجو ہونا

چاہیے کہ آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”میں کیا چاہتی ہوں۔“ وہ خود سے بولی۔ ”میں اس کی پروا کس کو ہے؟“

”کسی اور کو ہونہ ہو، مجھے ہے۔ مجھے آپ کی، آپ کے جذبات و احساسات کی بہت پروا ہے۔ آپ

بے فکر ہو کر مجھ سے سب کچھ کہہ ڈالیے۔“

”کیا کہوں۔ کیا سنتا چاہتے ہیں آپ؟“ وہ تذبذب کا شکار تھی۔

”یہ۔ رضا صاحب! بلا ہر سوالات بہت تکلیف دہ ہیں، نہ صرف آپ کے لیے بلکہ میرے اپنے لیے

ہی۔ لیکن اب یہ جانتا ضروری ہو چکا ہے۔ اس لیے میں اس طرح پر آ کر گفتگو کرنے پر مجبور ہوں۔ دراصل اب

ذوق بننا کسی کو بھی پسند نہیں ہوتا اور مجھے ہے کہ میں بے وقوف بن رہا ہوں۔“

”الماس! چند لمحے انہیں دیکھتی رہی۔ اسے لگا مٹان ٹھیک کہہ رہے تھے۔ فیصلہ کن موڑ پہنچا تھا۔

فیصلہ اسے ہی ملتا تھا۔

”مٹان!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ اچھا ہوا۔ آج آپ نے

ایک دیا جلائے رکھا۔“







۲۵۴

اک دایہ جادے رستہ

"جی۔ جی نہیں۔ امان تو پڑ چکی تھی بالکل بھی نہیں ہیں۔ میرے بڑے بھائی تھے ان کا انتقال ہو گیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہماری پرورش کی گئی۔ پچھلے سال ان کا انتقال ہو گیا۔

اس سے آگے بڑھنا ہی نہ دینا۔ اس کا ہوا رہدیتا تھا۔  
 ”چچ چچ چچ“ آئی ام دیری سو رہی کس ظلم میرا اقتصاد آپ کی دل آزادی کرتا تھا۔ میں تو رنج کی ماہیج  
 بیٹھا۔ تو اب آپ جا ب جا کر ہی ہیں اپنے گھر میں؟ سب سے بڑی ہیں بھائیوں میں۔“

”جی“ اس نے اجازت مل کر پوچھا۔  
 ”کتنے بہن ہوئی ہیں آپ لوگ؟“  
 ”تین بہن اور راج بیٹیں۔ ایک بہن کی شادی کر دی ہے۔ دوسرے ہوئی کے بعد اب درمیان میں گھر ہے۔“  
 ”آج کل وہ کون سا علاقہ ہے کم بڑی ہوئی؟“

”میں نے اسے شکر ہے خدا کا۔“ اس کا چہرہ خوش تھا۔

”میں نہیں! میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ٹاپیک اور شارٹ پیژڈ وغیرہ دیکھ لیں۔ پھر میں کوئٹہ کر کے آؤں گا، لیکن اگر وہاں سے بھی خاطر خواہ اضافہ ہو جائے گا۔ میں نے آج آپ کو ملنے کا ارادہ کیا ہے۔“

اگر میرا بپا اے دس دن کی تھپی پر جا رہا ہے۔ شادی ہے اس کی۔ تو ان چند دنوں کے لیے اگر آپ یہ کچا کر لیں  
 کیا ہی اچھا ہو۔ آپ کی جگہ میں یہما سخیل۔ لیں گی۔“  
 اس نے نظروں میں ان بھن بھر کر انہیں دیکھا۔

”جی ہاں تو۔“  
 ”تجربہ کاروں کا؟“ وہ مسکرائے۔ ”بے فکر رہیں۔ کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“  
 ”وہ خاموش رہی۔ کیا کہتا تھا؟ کیا نہیں۔ اے علم ہی نہ تھا۔“

”پھر حق سے آپ یہاں تھیں لی۔ اس میں پر۔  
انہوں نے کہنے میں رکھی چھوٹی میز کی طرف اشارہ کیا  
”ہیئر سیر“ وہ اُنکھ کھری ہوئی۔ ”اب میں جاتی ہوں؟“

وہ باہر آدوہ جس دلی سے کرے۔  
وہ کرے سے کل آئی۔ عجب تذبذب کا شکار ہو رہی تھی۔ بالکل نئے کام کا خیال اسے اُلجھن ہی  
نہا کر رہا تھا۔

وہ اپنی سیت پر واپس اٹھ کر وہاں بیٹھ گیا اور رات بھر سوچا سوچا۔

اس نے کہا: "میں جیسا ہوئی۔"

"بیلہ! بیلہ!" زارما خوشدلی سے بول رہی تھی۔ "کیسی ہو گی؟"

"بیلہ!"

”بیگم! زارا خوشدلی سے بولی تھی۔“ ”یہی ہو؟“  
 ”ٹھیک ہوں۔“ وہ مختصراً کہہ کر اپنا سینہ پر بیٹھ گئی۔  
 ”چاہیے کی؟“ مس مہبت نے پوچھا۔

”جیہیں۔ لم کر آ رہی ہوں۔“  
”عہدای صاحب کے ساتھ؟“ ذرا عجیب انداز میں مسکرائی تھی۔  
”نیلیم نے زہر عمری ٹکڑوں سے اسے دیکھا۔“

”بھئی کس زار! انسان کا اپنا ذہن اگر کھٹا ہو تو اس کی فطرتیں ہر جگہ رونا اٹھ سکتی ہیں۔ انسان کو اپنی فطرتیں ہر جگہ ڈالے رکھنا چاہیے۔“



خاتم خاموش ہو گئیں۔ وہ خاتون سب کے لیے بیٹھی تھیں۔ اسے (۱) اور

ہر دو احوالیں ہیں اے لودو! ہر صحن ہوں۔  
 "پھر کب کھریف لائے گا کہیں ا" خاقان کے انداز میں خوشامدی تھی۔

کھا کر نے کے قابل ہیں۔  
"تسیر ملک میں اکی چوان؟"

”خیر تو آج بھی گئے۔“ وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ ”میں اس قدر محنت بھی سہ سہ کر رہا ہوں کہ اس قدر قلم

”تم بھی اپنے طور پر کیا کرو۔ ایک آدھ پتھر میں لگاؤں کی پھر کسی بھی دن بات چلی کرے محوئی پیدا ہو۔ اس میں بھی مزید تائید بالکل برداشت نہیں کر سکتی۔“

"تھک گئی ہوں تھا پیہ جیہ۔"  
"سین کی پشت سے سر ہلک کر انہوں نے آگئیں سو رہ گئیں۔"

کئی دن سے دو کمرہ صاف کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ شاہی سے پہلے اسے بہنوں میں سب

بنا ہی جان پاتے تھے۔ بچے کے پورٹن کی صفائی کرنے ہی آیا کرتی تھی۔ اوپر وہ اور پڑا اپنے اپنے کمرے

”کم بخت جی کسی کام میں راضی ہوتا ہی نہیں ہے۔“

"کیا گندہ ہو رہا ہے کرو۔ آئے جانے والے کیا سوچتے ہیں کے، یہی بڑا کام رہا ہے۔ تیرا

جاملے اُتر کر اس نے ہر شے کی جھاڑ پونچھ لی۔ درختوں کی جھاڑ تہذیب کی ہے۔  
ان کو اڑا کر پھینک دیا۔

110

میں نے پہلے آغا جی اداں۔ ہر دور کی دنیا سے بچے لہ رہے تھے۔ اور اس سیر کی مختصر تصویر

یہ بھی "صفت خاتم حیران رو" کہیں۔ "جس نے دروازہ کھولا تھا"

ست خانم خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگیں۔ بہر روز اکتھیں سے کچھ اذہری کے تھے۔ روزوار

یہی دیر میں وہ چائے بنا کر

جا جائے گا کھانا بھی۔ "اس کی ماں کے لہجے میں ابلیسی سرزنش تھی۔ "وہ کہہ رہی ہیں تو جیسا ہمارا"

عفت خانم کے لبوں پر مسراہٹ پھیل گئی۔ اس عمر کی لڑکیاں اپنے اپنے رشتے آگے بڑھ رہی ہیں۔

اٹھ کر اندر چلی گئی تو انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

(دیہ کوڑکیس)۔

11-8267

رتھ دیکھئے اور ان پر غور کرنے کا کس میں یارا ہے۔ ہمیں تو اپنی بیٹی ایک شریف اور باعزت گھرانے میں نکالا ہے۔ اور بس۔ اور آپ کو تو محض دیکھ کر آج کی شرافت اور رعایت کی قسم کھائی جا سکتی ہے، دیے گئے ہیں شریفانے











اک داد ملانے لگا۔  
 ان دنوں میں موجود تھا۔ وہ سب سے نظر لانے کی ہمت نہ کر سکا۔ کمرے میں آکر وہ پہلے کئی سب

باجوں کے ذہن میں مگھول کر رہا دیکھنے لگا۔

پھر کمرہ کی گھول کر باہر نکلتے گئے۔  
 "بیٹا! تمہارا فون ہے۔ اور باہر کی کمرہ میں ہیں، آکر چائے دیجیے گا۔"

جنا نے اندر بھاگ کر اطلاع دی تو وہ تیز دوپٹہ ڈھک کر نکلا۔ پھر کچھ سوچ کر باہر نکلا آیا۔

جنا نے فون سینہ میں لاد ڈالا اور دیکھا کہ اس کے کسی دوست کا فون تھا۔ اس نے مختصر بات کر کے

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

ہاٹنے کا ارادہ کر کے پھر اس نے ترک کر دیا۔ دل ابھی ہی چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔ ڈیرہ لائی

کا دوسرے پر ڈالے "وہ کمرے سے نکل آیا۔"

صفت غائب مصر کی نماز سے فارغ ہو کر صبح پڑھ رہی تھی۔ جتنا کچن میں رات کے کھانے کی کڑوا

میں مصروف تھی۔

"جینا بانی! اگر رحمت نہ ہو تو چائے پلاؤ۔"

"رحمت کا ہے کی۔" جینا مسکرائی۔ "تم چل کر امی کے پاس بیٹھو، ہم ابھی لائے ہیں چائے۔ ہائیڈ

میں چائے پینے کا وقت ہے۔"

"وہ میرا پڑا ہوا صبح کا اخبار اٹھا، ماں کے پاس آ بیٹھا۔"

"انہوں نے صبح ختم کر کے ڈھنگا بھی پھر اس کے چہرہ تمام کمراس پر پھونک ماری۔"

"آج کے نہیں؟"

"بس امی۔ سوڈ نہیں بنا۔" وہ اخبار کی سمت متوجہ تھا۔

"نتیجہ بد۔ چند روز میں متوقع ہے۔"

"دیکھو بیٹا۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔ بڑے رتبے پر پہنچائے۔ پھر اس کے بعد تمہیں بھی ہیراز

ہاتھ ملتا ہے۔"

"ضرور۔" اس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ "بھائی جان اور شہروز کا ہی خیال رہتا ہے آپ کو۔"

صفت غائب نے اسے حسرت سے دیکھا۔

"ماں کی محبت پر بھی شک ہے تمہیں؟ دل گھول کر دکھا سکتی تو تم تینوں کو ضرور دکھاتی۔ اور بھائی

میں ہو بھی کیا سکتا ہے بیٹا! میری تو زندگی ہی تو تم تینوں کی محبت ہے۔ میرے لیے جس طرح اپنی آنکھوں میں

فرق کرنا شمار ہے اسی طرح یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتی کہ میرے دل میں کس کی محبت زیادہ ہے۔ ہاں، البتہ تمام

سے ضرور یہ شکایت کر سکتی ہوں۔"

"تمہیں امی! مجھے ملنا نہ بھٹنا!" وہ پھر پیچیدہ ہو گیا۔ "بہنی تو مشکل ہے کہ کوئی کسی کو اپنا دل گھول کر

دکھا سکے۔"

"نہیں بیٹا! مجھے تم سے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔" وہ محبت سے بولیں "خدا تمہاری عمر روز کرے۔"

خوشیاں دے۔ کامیابیاں دے۔ اور بھلا مجھے کیا چاہیے۔ آج دو گھنٹی کو ماں کے پاس آ بیٹھے ہو تو اتنا اچھا

ہے مجھے۔"

وہ دیر سے سے مسکرا دیا۔

کال میں بھی تو وہ اُٹھ کر گیت گونے چل دیا۔

باہر پھر پیچیدہ اور سب کو مڑی تھی۔

"اسلام علیکم!" وہ ایک طرف کو ہو گیا۔ "تحریف لا ہے۔"

"اعوذ الی مہا نے دانستہ ایک نگاہ بھی نہ اٹھائی تھی۔ خیر زور احمد نے بھی اگلی نظر ڈالنے کی جرات

کی۔ سر جھکا کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔

"جینا بانی! چائے مجھے میرے کمرے میں ہی دے دے جانا۔"

جینا کو ہدایت دے کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ چند روز قبل والا واقعہ اپنی پوری تالی کے

کمرے میں آکر چائے نہ کر سکا۔ کمرے میں آکر وہ پہلے کئی سب

باجوں کے ذہن میں مگھول کر رہا دیکھنے لگا۔

پھر کمرہ کی گھول کر باہر نکلتے گئے۔

"بیٹا! تمہارا فون ہے۔ اور باہر کی کمرہ میں ہیں، آکر چائے دیجیے گا۔"

جنا نے اندر بھاگ کر اطلاع دی تو وہ تیز دوپٹہ ڈھک کر نکلا۔ پھر کچھ سوچ کر باہر نکلا آیا۔

جنا نے فون سینہ میں لاد ڈالا اور دیکھا کہ اس کے کسی دوست کا فون تھا۔ اس نے مختصر بات کر کے

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔

فون بند کر دیا اور باہر کی جانب بڑھا۔







مض کی ایک نگاہ کے سہارے اس نے دنیا الٹائی تھی کہ آج سے کتنی ہی دیر میں اس کی موت ہو جائے۔

ہے کہ اس کے لئے لوگوں کے ساتھ وہ دونوں اپنی اپنی عہد ناموں سر جھکائے جیسے ایک آدمی سے کہیں کہ

”آپ میں جو مجلس چھے ہوئے ہیں، انہیں میں اپوری طرح سے پچکان چکا ہوں۔“

”پچائیں سر۔ آپ میرا حوصلہ بڑھا رہے ہیں یا۔“ وہ سرمنڈلی سے اٹھیاں جھٹکا کر رہی تھی۔ ”ورنہ مجھے کتنی کتنی محنتیں کی مالک ہوں۔ مجھ میں کسی طرح کے کوئی کس نہیں ہیں۔ بس یہ آپ کی غزالی علم ہے کہ میں کتنے دن مجھے ہزارشت کیا ہے۔“

عزیز! آج اس کا دواں دن تھا۔ اور ان دس دنوں میں انہوں نے عرفان عبادی کے ساتھ کام کرتے ہوئے آج اس کا دواں دن تھا۔ اور ان دس دنوں میں انہوں نے

۱۷ بہت کچھ سیکھا دیا تھا۔  
 آپ کی مایہ نیک اور اشارت پند ہرگز نہ ہو جائے گی۔ دیکھیں ہمیں آپ

”اے سب آپ کی مہربانی ہے اتنا کچھ تو میں تین چار ماہ میں بھی نہ سیکھ پاتی ہوں کہ ان کی دلی خواہش۔“

”میری مہر مانی؟“ وہ دھیرے سے لے۔ جس سی! انسان کا ہونا حوصلہ اور ابراہیم کی منت سماجت حال نہ ہو کہ اس کا دل کچھ کا نہیں آتی۔ جس انکھ محنت کے ساتھ آپ نے سب کچھ کہنے کی کوشش کی وہ رہا ہر ایک

...

عظیم نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ لڑکی لی  
ہو مان منت عبا کی صاحب اسے بہت اچھے گئے۔

زہد کی میں بھی کسی نے اس  
کو اہ انا آت کتنا مست یکنے لگا تھا۔

”کلمہ آتے آتے ہیں سر؟“ اے ایک نکتہ خیال آیا۔

”آپ کیا چاہتی ہیں؟“ وہ نسیم سے انداز میں مسکرائے۔

وہ ہولے سے مسکرا دی۔ پھر اس نے غور سے لباس کو دیکھا۔

اس کا رویہ ہمیشہ سے بڑا مختلف تھا۔ اس کی جی سی موتی سے، چمک کر باتیں کرنے کی جادوئی زندگی تھی۔ ہمیشہ غمگین ٹھہر کر، سنبھل سنبھل محسوس کرتی تھی۔ اس کے انداز کا نمایاں ترین وصف اس کا تھوڑا سا ہنسنے کا ایک ٹھہراؤ سا محسوس ہوتا تھا۔ لیکن آج وہ بڑے مختلف رویے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ جیسے کوئی لکڑی کے بات کے انوار چھپی ہو کر اس سے سنبھلتی نہ ہو۔ بار بار بار ٹھٹھے کی کوشش کرتی، شوقی، شرارت، کبھی کبھی لکڑی کے بات سے آج آج وہ بار بار موتی پر آمادہ نظر آتی تھی۔

”اے کیا دیکھ رہی ہو؟“ الماس نے پوچھا تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ اس نے سر جھٹکا۔

”چلو نیچے چلیں۔ تاکہ انظار ہو رہا ہو گا۔“ الماس طعنی ہوئی۔

ان میں بہت سے لوگ تھے۔ ان میں سے اکثر ان کی سبائری میں ہی رہ جاتے تھے۔ وہ وہاں کے حالات کی "وہ وہاں کے حالات کی" میں نہیں جانتے تھے۔

一、二、三、四、五、六、七、八、九、十、十一、十二、十三、十四、十五、十六、十七、十八、十九、二十、二十一、二十二、二十三、二十四、二十五、二十六、二十七、二十八、二十九、三十、三十一、三十二、三十三、三十四、三十五、三十六、三十七、三十八、三十九、四十、四十一、四十二、四十三、四十四、四十五、四十六、四十七、四十八、四十九、五十、五十一、五十二、五十三、五十四、五十五、五十六、五十七、五十八、五十九、六十、六十一、六十二、六十三、六十四、六十五、六十六、六十七、六十八、六十九、七十、七十一、七十二、七十三、七十四、七十五、七十六、七十七、七十八、七十九、八十、八十一、八十二、八十三、八十四、八十五、八十六、八十七、八十八、八十九、九十、九十一、九十二、九十三、九十四、九十五、九十六、九十七、九十八、九十九、一百。

م۔ ان صبا۔ اماں سے اس ہاؤز پر۔ دوست ایٹ لائلک دس۔ کیا انصوں کا سا لاپیرے  
صبا بھنے، چھوٹے قدم اُٹھائی سب کے درماں آگئی، جگا، جگا، جگا

دانیال کی والدہ اور والد کو سلام کیا۔

جس نے اسے سہارا دے رہا تھا۔

”کوئی اور غریب بھی آپ کی توجہ کا طالب ہے اور غائبِ حق بھی!“

گھرا ہوا بڑے اعتماد سے آکر اس کے برابر بیٹھا تھا۔

”یا ہمیں سلام کرنا اگر آپ کے شایان شان نہیں چاہیں پہل ہم کر لیتے ہیں۔ السلام علیکم“

دانیال بنیاداً صاف ہیں رہا ہے۔۔۔ مرید ملی سے سچا اور ازاجہری سی۔

ہرگز میں اسی! وہ کرایا۔ صرف ان کی چٹچاہٹ دور کر لی ہے۔

جنا: اماں اس سے دوسری طرف اسی۔ اس طرح سے تیرا کر رہی ہو؟ ایسا ملک برا ہے

”مہمانے مح

جود میں طوفان سہا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ چٹائی کی سمت بھاگ نکلے۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتا تو کہ

مچھوٹ مچھوٹ لڑو دے۔ اسے لگا۔ وہ اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر نکل پڑا ہے۔

”اسلام حسینؑ اس نے اپنے بالوں میں ایک مائوس آواز سی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر تھام لیا۔“

1000

سیاہ چمپ سوٹ اور سیاہ لائیکوٹ والی کرے شرٹ میں ملبوس فیروز احمد اس کے سامنے تھے۔

اس نے صبا کو سلام کیا تھا یا کسی اور کو۔ اسے علم نہ ہو سکا۔ اسے تو بس اتنا علم تھا کہ فیروز احمد تھا!

اے کے دیکھا تھا۔ اور اس کے اندر جتنی بے قرار بیوی کو اس نگاہ نے دھیرے دھیرے قہقہے کرنا شروع کیا۔

کے اندر حتیٰ آگ پر ٹھنڈا پانی پڑ گیا تھا۔ ریزہ ریزہ کھرتے و جہر کو دسمینے کے لیے وہ ایک ٹکڑے ہی کا ٹکڑا ۱۱۔











[illegible]

۱۱۲  
 "بے منت کس اکی" "مہاراز ترپ کئی۔  
 دیکھے دل کی آواز ہونٹوں سے نہ کھلے۔ تب بھی اہم جانے  
 میرے کہنے نہ کہنے کے کیا ہوتا ہے۔ جی۔ دیکھے دل کی آواز ہونٹوں سے نہ کھلے۔ تب بھی اہم جانے  
 اپنے حوصلوں میں نہ محسوس۔ ڈاکٹر انہیں سکون اور نگہداشت دینے لگے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ہلکے ہلکے

ایک ایک قلم

میں نے کہا کہ میں نے تو سب کو سنا ہے۔ اس کا اسے اتنا اندازہ ہو کر نہ تھا۔ اس نے تو سب کو سنا ہے۔

جہاں کے بغیر جس سے کھر والوں سے ملے گا اور ساری بات خیر کر دے گا۔ لیکن اسے جانب لے کر مل کر دے گا۔

سب اہل سے چاہتا ہے کہ وہ کسی چھوٹی سی جگہ پر رہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے کسی چھوٹی سی جگہ پر رہنے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے کسی چھوٹی سی جگہ پر رہنے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے کسی چھوٹی سی جگہ پر رہنے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

پھر بھی اللہ اس کو بخانے کیوں۔ یقیناً ساتھ کہ عثمان اس کے ساتھ کو رازی رکھیں گے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔

لیکن اس نے دل سے دعا کی تھی کہ رضا کھر پر ہی ہو۔ اس نے کمال تلاش کی۔

”کوئی بلا“ ایک آواز ابھری جو رضا کی خاطر تھی۔

$\frac{1}{\sqrt{\pi}} \int_{-\infty}^{\infty} f(x) e^{-x^2} dx = \frac{1}{\sqrt{\pi}}$

”اللہ اس پر“ اس کی بااختصاص کل کہیں۔ ”اچھا۔“ کیا کسی متعلق الطوار کے آؤ۔۔۔ باہر کہیں کوڑی ہوگی“  
اس نے بہت کراہے اللہ آ نے کارترہ دیا۔

10

میرزا کا سلام و کھیر کہہ کر یہ استقبال کر رہا تھا۔

طریقہ انجمنیہ میں زمین برادر کرنا۔

جائیں گی۔ آپ کی ہول۔ ہمیشہ کے لیے تمہارے اس آپ کی ہول رضاؑ

والله اعلم بالصواب

”ہاں رضاؑ وہ کہیں پر پہنچے گی۔“ گھر والوں کو علم ہو چکا ہے کہ جس نے تم سے نکاح کر لیا۔ اب اس میں اللہ عزوجل کی صفات تکبر و کینیت کی دعا دار رہیں گی۔ اور مجھے اس طرح سب کو ہمیں کراہت ہوگی۔

کہ کہ میں سوچا ہے پھر اے سماء باندھ کر یہاں پہلی آئی۔ آنحضرت! اس میں تمہاری ذمہ داری تھی۔

یہ ہے۔ جن جوانانِ مریں کو مارے گئے بہت کچھ عطا کر دیں۔



”اللہم یتیم اہی خضرت“ وہ خوشی سے بولا تھا۔ ”اگر تم صبح سویرے میرا کھانا لیں گے۔“

”یہ تم اسلام۔“ میں کیا کیا ایک رہے ہو۔ ”وہ اس کی بات نہ سمجھیں تھے۔ خدا کرے۔“

”آپ تمہیں جیسا اہی خضرت باقی لوگ جیسے چاہیں“ وہ اس رہا تھا۔

”اب اگلے نئے صحت سے ہیں۔ میں ایک خوشخبری ہے تمہارے لیے۔“

”جیسے لیے توکی وضوئی آپ نے؟“

”ہاں وضوئی۔“ وہ اس رہی۔ ”خوشخبری ہے تمہارے لیے تمہیں۔“

”اب تمہیں کی بات تھی زیادہ دہشتیں۔ جہانکی بات کو میری طرف سے مبارکباد دیجئے۔“

”جی ہاں۔“ آپ تمہیں خود ہی مبارکباد دیاں دے۔ جس کو کسی دینہ پاوے۔ جس جہانکے لئے اس کی دہشت کی

جہانکے لئے تمہیں ہے۔“

”جی ہاں۔“ وہ اچھل ہی پڑا تھا۔ ”آپ تمہیں یہی دہشتیں دہشتیں خضرت۔“

”جی ہاں۔“ وہ اچھل نہ آوے۔ ماری تیاریاں کرنی تھیں۔

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ دونوں میں آ رہے تھے۔ ”اس سے خوشی سننا مشکل تھی۔“



216  
 "جانتی ہو میں نے رات کو خواب میں تمہیں دیکھا۔ آکھ کھٹنے سے لے کر ارب تک کا وقت کہ میں تم سے  
 مل رہی ہوں۔ میں کچھ کہنا چاہوں گی تو نہیں سمجھ سکتا۔ میں خود اپنے بس میں نہیں ہو سکتی۔"  
 یہ سن کر وہ خوف زدہ ہو گئی۔  
 "مت ڈرنا، یہی باتیں!" وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”کے نہ کروں۔ نہ کروں تو جیوں ہے۔ کیا! ہمیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔“

انہوں نے آئینوں میں وہ جذبے عیاں تھے۔ جتنوں نے انہیں دھڑکتے دل کے ساتھ نظریں جھکا کر مجبور کر دیا۔

”یوسف میاں! کب آئے؟“

ہاں کی آواز پر دونوں بری طرح سے چوٹے گئے۔

”السلام علیکم ایسی ہیں آپ!“ یوسف کھڑے ہو گئے۔

یہ خیم اپنی بجائے بیٹھی رہ گئی۔ ابھی اسی وقت جو لکھ ان دونوں کے درمیان آکر گزر گیا تھا۔ اس سے کی ٹاپڑا  
اٹاں تھی۔ اس خیال نے اسے سر سے پاؤں تک پتھر کی بنا دیا تھا۔

”تعلیم!“ اس اس سے مخاطب تھیں۔ ”خدا، خدا، چنی خانی میں جا کر نہیں کا کا تھہ بٹاؤ۔“ وہ بھوکوں پہلی  
مکڑ سے اٹھی اور باہر آ گئی۔

اس کا اپنی حالت پر ماتم کرنے کا جی چاہ رہا تھا۔

”نہم اور ہم اس کے چہرے پر اتم جذبات دکھ کر پریشان ہو گئیں۔“  
”کیا ہوا ہے؟“

اور وہ مزید مضطرب نہ کر پائی۔ ہر طرح سے رودی۔ اماں کی پرگمانی، اپنی بے بسی، یوسف کی ذہینیت  
کتنے ہی احساسات تھے جو اسے زائل نہ چلے جا رہے تھے۔

رہ گئے اسے پانی کا گلاس تھا یا۔ مگر اس کے آنسو پونہ گئے لیکن وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

”اماں! اماں! بھوکو کیا ہوا ہے؟“ مریم نے جلدی سے پوچھا تھا۔

پچھتے ہیں۔ ”وہ سر ریلجے میں بوسے۔“ انہیں سمجھتا دے زلاتے ہیں۔ اپنی بے قوفی پر ہاتھ ملاتی ہیں۔

ہم رو رہا ہوں کہ دم بخود بھی تھی۔ جھوٹی بہنوں کے سامنے ادا ہونے والے اماں کے الفاظ نے اماں پر سات سمندروں کا پانی کا پڑا دیا تھا۔

اماں اس سے اس حد تک بڑگان تھیں۔ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ مریم اور اس کو کہتے اور  
 کہتے نہ سمجھتے والی کیفیت میں چلا کھاتا نکالنے لگی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ ان سوالوں  
 سے نظر ہٹائے، سر جھکائے بیٹھی تھی۔

مہر سے نکلی تو دماغ عجب سن زدہ کیفیت کا شکار تھا۔

ساری رات وہ صبحی آنکھوں سے جاگتی تھی یہ وضعت زہہ کر ڈالنے والے حالات کے سامنے وہ اس قدر تھکتی تھی، یہ احساس ہر طرح کے احساسات سے اسے عاری کئے دے رہا تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کس قدر بیمار تھی اور لوٹ پھوٹ کا حکار ہے۔ کسی کو پورا نہ تھی کہ یہ کما سوجاتی ہے، کیوں پریشان رہتی ہے۔ کوئی اس کا نام

ایں ادا جلائے

ازادہ انداز میں آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ کسی سے یہی طرح سے کہہ سکتی تھی۔ لیکن یہ سچ  
سرِ حلقہ ہے،

[illegible]

یہ کہہ بھاگی۔ وہ تو جس کیفیت کا شکار تھی اس میں  
نہلم اپنے خواصوں میں آئی تو اس کے تن پر لڑنے میں ایک لمحہ بھی - وہ تو جس کیفیت کا شکار تھی اس میں  
نہلم اپنے خواصوں میں آئی تو اس کے تن پر لڑنے میں ایک لمحہ بھی - وہ تو جس کیفیت کا شکار تھی اس میں

اے اچانک خود پر اختیار نہ رہا۔ اس کا رعبان تمام کردہ اس پر طمانچہ برسانے لگی۔

”اتحاد ازمائے ملّی کا چاہئے ہاکھ پڑا۔ جسے چاہا جمہوریا، عورت تمہارے  
 ”اتحاد ازمائے ملّی“

جہاں پہنچا ہے۔ تو اس نے ریلوے کا کر جان چھوڑا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ اتنا کمزور نہ تھا کہ  
 ایک جمع ہونے والے تو اس نے ریلوے کا کر جان چھوڑا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ اتنا کمزور نہ تھا کہ  
 وہ تو کمزور مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں کسی انسانی جمع کا غماز نہ لگے۔ سرشار  
 انسانی لڑکی کے آنکھوں میں اچھے چہرے پر محسوس کرتا اس کے نزدیک بڑا خوشگوار عمل تھا۔  
 وہ ان کے نزدیک آنکھوں میں اچھے چہرے پر محسوس کرتا اس کے نزدیک بڑا خوشگوار عمل تھا۔

رانے بہت سے کاغذات بکھرائے وہ سر قہارے بیٹھی تھی۔

کچھ کام کرنا چاہتی تو نظروں میں ایک طنزیہ مسکراہٹ سما جھڑک آ جاتا۔ اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتا، اس کے غصے کی کمزوری سے خطا اٹھاتا ہوا۔ اس کی تربیت کے احساس سے مرشار ہوتا ہوا۔ ایک کراہی اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ جتنی مجبور تھی وہ کتنی بے بس۔ اس کا گریبان پکڑ کر اسے طمانچہ لگائے بھی تو کیا حاصل ہوا؟ یہ احساس کہ اس کا گریبان پکڑنے سے وہ اس کے کتنے نزدیک ہوگئی تھی۔ یا طمانچے پر اس نے کدور لانا وہ اس سے کتنا مس ہوئی تھی۔ تاہم یہ نہ ترین ہستی کی آنکھوں میں اترتی چمک کا تصور اسے بے حال کیے دے رہا تھا۔ غلامی اس تصور سے مول ہو جاتا کہ خیال رگوں میں جھکن بھر رہا تھا۔

وہ ایسا تھکا ہوا پرندہ تھی جو کسی بھی وقت کہیں بھی گر سکتا تھا۔ بھی نہ اٹھنے کے لیے۔  
”کس علی۔“  
”کس علی۔“

وہ چومک کر سیدی ہوئی۔

عباری صاحب دونوں ہاتھوں کو میز پر ٹکائے اس سے مخاطب تھے۔

”مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“

“53”

”بہت دیر تک اس کی سمجھ میں بھی نہ آیا۔“

“5”

"کیا بات ہے؟" وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ "اس قدر کھوٹی ہوئی ہیں کہ، آپس آنا محال ہے۔" وہی سہ

”جہاں کوں پریشان ہو طبیعت خراب ہے آس کی م“

”وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہی۔۔۔“

بجلیہ جہڑ، کٹنٹیل پر سفید بال، سیاہ فریم کا چشمہ، ایک مہرمان سر پہ نظرائے وہ ہے۔ ال بی







”دبا ہوا رشتہ کو کوہِ مونس میں اٹھائے اندر آگئے تھے۔  
شبنم اپنے سچے سے سچے بے نیاز کسی سوچ میں کم سیدی لٹٹی ہوئی تھی۔ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔“

”یہ تو بھئی سنبھالو اپنی بھائی کو۔“

انہوں نے نہایت سے جنگلی سے مونس کو اس کی کود میں ڈال دیا۔ شبنم کو نہایت کوفت محسوس ہوئی۔ اس کی شکارِ قدورے ادھر کو چڑھی ہوئی تھی اور دودھ پچا بھی بنانے کہاں تھا۔

مونس کو سنبھالتے ہوئے اس نے اس نے ایک نظر ریاض بھائی کے چہرے پر ڈالا، وہ نہایت سہا تنگی سے اس کے سر پرے کا چہرہ لے رہے تھے۔ سخت اور نرمی کی سے اس کا چہرہ تپ گیا۔

”کیا بات ہے بھئی کو کوئی سلام نہ دھانہ نہایت نہ جانیت۔“

”لہو بھر میں اس کے تاثرات کو بھانپ کر اپنا اعزاز بدل لیا کرتے تھے جلدی سے دور پڑی کہیں پر جا بیٹھے۔“

”م کیلے آئے ہیں۔ آند کو ساتھ نہیں لائے۔“ شبنم اپنے تاثرات پر قاف پاتے ہوئے بھٹکل بلبل بلبل۔ مونس کو اس نے برابر میں بٹھا کر اپنے کپڑے درست کیے، کچھ کے ادھر پڑا دوپٹہ اٹھا کر ڈھک سے

اڑھ چلا۔ اس دوران وہ ریاض بھائی کی نگاہوں کو اپنے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ محسوس کرتی رہی تھی۔ ہمارے نے ایک لمحے کی نگاہ ان پر ڈالی۔

”اں..... ہاں کیا کہہ رہی تھی تم؟“ وہ یک یک گڑبڑا گئے، ہاں اچھا وہ آند، ارے وہ کو کوہِ مونس سے نیچے بیٹھی تھا اور انتظار کر رہی ہے۔ یہ مونی ضد کر رہی تھی، میں اسے یہاں لے آیا، شبنم! تم اس طرح اٹکی

کیوں پڑی رہتی ہو؟“  
انہوں ایک بار پھر اعزاز بدل کر پوچھا تھا۔

”طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔“ وہ قدرے بیزاری سے بولی۔  
اس طرح کے سوال و جواب اسے حد درجہ پریشان کرتے تھے۔

ریاض بھائی عجیب طرح سے سکرائے۔  
”کیا بات ہے۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟“ وہ راز داروں سے پوچھ رہے تھے۔

”خاص بات سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ وہ تھک کر بولی۔  
”بھرا مطلب ہے، خیر جانے دو، یوسف ہماں سے مجھے یہ امید نہیں ہے۔“ وہ ہنسنے ہوئے اٹھ کھڑے

ہوئے۔ شبنم کے تکیوں سے لگی تو سر پر جا کر بیٹھی۔ اس سے پوچھ کر وہ کچھ کہہ پائی، وہ باہر جا چکے تھے۔ اصحاں بہ

تھی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ تھی دامن کیسا نکھلا راز تھی۔ کوئی اس کے خالی دامن میں جھوٹی کے

جھونے کے ڈال دیتا تھا تو کوئی طرح کے نوکیلے کاٹے۔  
بڑی دیر تک وہ وہیں بیٹھی ہونٹ چباتی رہی اور آنسوؤں کے سیلاب میں بند ہونے سے کی کوٹھن کی

رہی پھر اس کے برابر بیٹھی مونس نے بلند آواز میں اس کی خاموشی کے خلاف احتجاج شروع کیا تو وہ اسے اٹھا کر

باہر نکلی گئی۔  
نیچے آند اور دھندہ چٹنی ڈیا کے پاس موجود تھیں۔ جب سے ڈیا کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ اس نے اپنا سامان نیچے کے کمرے میں سینٹ کر لیا تھا۔

”کمرے میں داخل ہوئی تو تینوں اچانک ہی خاموش ہو گئیں، شبنم کو منجانب سے کہیں یہ اصحاں ہوا کہ“  
لوگ جو تھک کر رہی تھیں وہ اسی کے متعلق تھی۔

”اسلام! شبنم۔“ وہ آند سے لٹے تھے۔  
”پتہ اسلام! آند نے اسے گلے سے لگایا۔“ کہیں اٹکی ادھر پڑی رہتی ہو۔ نیچے ہی رہا کہ

”بہت بھائی گھر نہ ہوں، اکلیا دی خواہ مخواہ خود سے اور لوگوں سے تیار ہونے لگتا ہے۔“  
بہت بھائی گھر نہ ہوں۔ ”بڑا شرم دئی بھائی! جب آدمی خود سے اور لوگوں سے تیار ہونا چاہئے تھی تو

”ادھر کیا بات کی ہے۔“ بڑا شرم دئی بھائی گھر نہ ہوں، جب وہ ادھر جاتے ہیں تو یہ

ایک دبا ہوا رشتہ۔ ادھر یہ بھائی ہی اس وقت ہیں جب یوسف بھائی گھر نہ ہوں، جب وہ ادھر جاتے ہیں تو یہ

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،

ایک دبا ہوا رشتہ۔ اب تک تم اپنے اور ان کے درمیان موجود دیوار کو گرا دی نہ پائیں؟ اب لکھی بھی کیا ہو سکتی،







الحاکم کا پہلا خط۔ جس میں زرارہ کا نام ہے۔ اس میں زرارہ نے کہا کہ میں نے آپ کی کوئی بات نہ سنی۔

”کیوں کر لی ہیں آپ ایسی باتیں؟ ہم چپے ہوئے تھے میں ہوں کیا جڑا ہوا تھی؟ میں سمجھ نہیں پاتی بس ذرا دبا کر آپ دراصل کس میں دھکیلی رکھی ہیں۔ مجھ میں؟ مہمیں؟ صاحب میں.....؟ کیا آپ کے گھر میں کام ہے جو آپ کو ایسی فضول باتیں کہتے رہتے ہر مجبور کر رہی ہے۔“

”نیوٹن علی۔“ پھر وہ صبر سے ہوئے بچے میں یوں اچ سے آخر سال تک جب میں نے اپنے کمرے کی طرف توجہ کی تو وہاں پر ایک کتاب تھی۔ اس کی ہی مصومہ، ایسی ہی کھڑی، رفاقت سے جا مل گیا۔ یہ قدیم بارگاہ کلا تھا، تب میں بالکل تمہاری محسوس تھی۔ اس کی ہی مصومہ، ایسی ہی کھڑی، رفاقت سے جا مل گیا۔

ہے اور ہم پر وہ - اس نے پٹھانوں میں دبا کر بے پناہ ضبط کرنے کی کوشش کی، پھر سرخ چہرے اور ہنسنے والے منہ کے ساتھ بولی۔

وہ بلی اور تتر تتر قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

۱۱) انہی شخصیت کی تعمیر نہایت مضبوط بنیادوں پر کرے گی۔ اعجاز، اپنی ذات کے یقین اور اپنے فیصلوں میں آزاد

اب بیٹھ کر لے اس کی ماں سے قطع تعلق کر چکا ہے۔ کیونکہ وہ راشدہ عظیم حسنی دہلو اور کمرہ عورت کے انکمائی گذار سکتا تھا، ظاہر خان کو تعلیم یافتہ، پونہ، قدم سے قدم ملا کر چلنے والی مضبوط جیواں سناہی کی خوش

لی اور ماہرہ یکہم ان تمام خصوصیات سے بے بہرہ تھیں۔ ان کی تعلیم تو معمولی تھی ہی۔ زنگی کے دور میں ان میں بھی وہی کم از کم اور روشن خیالی کا مظاہرہ نہ کر پائیں۔ ہر لحاظ خوف زدہ نظر آنے والی ہر مسلمانہ تھیں۔

آتی ہوں۔ اب اگر میں تمہیں ساتھ لے جاؤں تو وہ شاید سنا ہی نہ آئے اور پھر تم اچھے بچے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں، اس طرح سے اے فراموش کر کے بھلا تجھے تو بہت برا لگے گا اور اسے یہاں آنے میں دیر ہی لگتی ہے۔ مگر تم آج

”جہاں جھوٹے ہیں اور سچا ہٹ گیا۔ اور سر باز میں دے لیا۔  
”یہ صاحبیت دان سے نہیں آئی۔“ وہ خود مخاطب تھیں ”اور نہ اس کی والدہ ہی آئیں۔“

”کچھ نہیں۔“ وہ سیدھا صوکر پوچھ سونے لگا تھا ”ای اسی بائبل میں ایسے لڑکے سے ہوئی ہے۔“

”اشاء اللہ برا خود جوان ہے۔ خاندان بھی اچھا ہے۔ شریف لوگ لگتے ہیں۔ تم تو اسے ملا کر“

”کیا مقصد ہے ان باتوں کا۔“  
اس نے چونک کر ہاں کی سمت دیکھا پھر کہنا لگا سا ہو کر مسکرا دیا۔

انہوں نے گہرا سانس بھرا۔  
 ”شکر ہے اس رب کا اولاد کی نعمت سے نوازا ہے اس نے۔ احسان ہے مولا تیرا۔“

نام آف ہونے کے بعد وہ چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ عرفان عمامی صاحب گھنڈہ پر پہلے کی ضروریات

”جاری ہو۔“ وہ اندر چلی آئی۔  
”جی“ اس نے مختصر کہا۔

”آفیسر صاحب چلے گئے۔“ اس کی مسکراہٹ میں عجب کائنات تھی۔  
ظلم نے دونوں ہتھیلیاں میز کی سطح پر رکھ کر خود، روتا ہوا مانے کی کوشش کی۔



اکی دہائی کے وسط  
اس نے جاتے ہوئے کا شکوک رکھنے کی فکر پھر نہیں ہوئی۔ وہ اپنی کرہائی بھی۔ لیکن ایک مرتبہ بھی اس کا قرون نہ

الہام خود کو ایک تصور میں پیشا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

”ملازم سے پہلے بھی دی رکھتے تھے اس کے پریشان کن خیالات کا سلسلہ چند لمحوں کے لیے موقوف کیا تھا۔“

”کون؟“ اس نے دہشتی آواز میں پوچھا۔

”ملازمہ کھلا اور حشاش خان نمودار ہوئے۔“

”ہاں، وہ دیکھ سکتا ہوں؟“

”آج ہے۔“ اس نے دونوں ہی بہتر سے نیچے لٹکا لیے۔

”اندر آکر اس کے سامنے رکھنے پر تم دروازہ کھولے۔“

”کی کسی ہیں اسب؟“

”کچھ دیر ان کی جانب سے کسی بات کا ختم کر دیا کہ ہوا تھی۔“

حشاش خان نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا ان کی آنکھوں میں سرخ زور سے نمایاں تھے نہ جانے وہ جانتے

ہے یا نہیں۔ کچھ اور بات تھی۔

”جی جان خدا کا شکر ہے اب مدد نصرت میں۔“ وہ لمحوں پر غور کر رہی تھی۔ ”آپ بیس کی نہیں ان سے؟“

”الہام نے گھر سامنے اور دوسری جانب دیکھنے لگی۔۔۔ پھر کے کھولنے سے وہ قائلین کو کر رہی

تھی۔ حشاش خان کی نگاہوں نے کچھ دیر اس کے نرم گلابی چہرہ کو دیکھا۔

”آپ کیسے بیٹھنے کا حکم ہیں۔“ پھر انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا ”جو کچھ بیٹھا تھا وہ قوت چکا،

بڑ بیٹھ رہے ہو جانی چاہیے۔“

”امی بہت خفا ہیں مجھ سے۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”تو اب بھی چاہیے انہیں۔ آپ نے ان کے نرم روی اور اتحاد کا بہت غلط استعمال کیا ہے۔ الہام نے

پچھلے سے ان کی سست رخ کیا تھا۔

”مجھے غلامت سمجھتی ہے۔“ وہ رسائی سے بولے ”میں یہ سب کچھ اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ

بہن کی غیرت ہو چکی ہیں اور آپ کے اقدام سے مجھے محسوس ہو چکا ہے۔ درحقیقت ایسا ہونا تو ہے۔ لیکن فی الوقت

نہایت بات نہیں کر رہا، میں آپ کو یہ سمجھانے آیا ہوں کہ پہلے تو آپ جی جان کے اتحاد کو محسوس ہو چکا کر ان کا دل

ملانی بھی ہیں اب ان سے معافی نہ مانج کر آپ مزید کئی کر رہی ہیں۔ وہ لاکھا آپ سے خفا تھی، اندر سے اس

بات کی خیر تھی کہ آپ آکر ان سے معافی مانگیں، شرمندگی کا اظہار کریں، انہیں مطمئن کر دیں، انہوں نے غلطی کا فیصلہ کر لیے

اجازت کیا ہے کہ آپ ان کے لیے جو طریقہ کار آپ نے اپنا دیا غلط تھا، آپ نے کئی کو بھی کچھ سمجھے یا جانے

نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی بات ہے۔ اس پر دیکھنا آپ کو سفرت طلب کرنی چاہیے اور آپ جی کہ اپنی خود مری

عائلا یہاں بھی اس بات کا انتظار کر رہی ہیں کہ دوسرے لوگ آکر آپ کو سنا سکیں۔“

”اسے سمجھانے آئے تھے لیکن اندرونی جذبات سے مطلوب ہو کر اپنی ذاتی کھلی کا اظہار کرنے لگے تھے۔

چند لمحوں خود پر قابو پانے میں لگے۔

”آج کی اہم سوری!۔“ پھر وہ بولے۔ ”میں شاید جذباتی ہو رہا ہوں، پتا نہیں آپ سے باز پرس کرنے کا

اک دہائی کے وسط

ان پر اپنے ماں باپ کی سخت تربیت کے اثرات اسے گہرے تھے کہ وہ باوجود کوکوش کے خود کو اپنے شوہر کی راجی

کے دیکھ میں نہ رکھ سکیں۔ ظاہر خان پہلے ملازمت کے بہانے بیرون ملک چلے گئے اور پھر وہاں سے واپس

واپس کی خبر نہ ہوئی۔

یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے راشدہ بیکم کی حیرتوں سے زمین چھوڑی۔ سر پر آسمان۔ ماں باپ

کی شادی کے دوسرے تیرے سال ہی کے بعد دیکھ دینا سے سوسا رکھے تھے۔ لیکن بھائی اسے اپنے شوہر

میں خوش اور مطمئن تھے۔ چار بچوں کے ساتھ کون تھا جو انہیں اپنے گھر میں خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیں۔

اپنے میں دلدادہ خان ہی تھے جنہوں نے آ کے ہند کر ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور بھائی کی زیور بھائی

اس طرح سے معافی مانگی تھیں وہ خود اصل قصور وار ہوں، اور ہمیشہ کے لیے ان کا اور ان کے بچوں کا مانگوں

کے، نہ صرف وہ بلکہ ان کی بیٹی، حاسمہ جی بھی کھلے دل کے ساتھ اپنا آدھا گھرانہ کے حوالے کر کے تھیں

اور مطمئن تھیں۔

وہ سب ان کے گھر میں پورے اختیاق کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی نہ صرف شہر و قریب بلکہ

خواتین بھی خوش دلی کے ساتھ پوری کی جاتی تھیں۔ دلدادہ بھائی نے بھی بھی خود کو چار بچوں کا باپ نہ سمجھا

بیشک یہی کہتے کہ وہ میرے آٹھ اولادیں ہیں۔ انہوں نے سمجھی بھی راشدہ بیکم اور ان کے بچوں کو کسی حد تک کی

محسوس نہ ہونے دی تھی، لیکن بھائی نے کب اور کیسے وہ کیا خلا تھا جو الہام ظاہر خان کے اندر پیدا ہو گیا۔

اپنی ماں پر بیٹے والی کہانی تو بہتاز کے بھی علم میں تھی ابھار کا شرف اور مشق کو بھی اس کی جڑ تھی لیکن

نے الہام کو خفا سے حسرت کیا تھا کہ وہ زندگی کے پہلو کو اس واقعہ سے متاثر سے دیکھنے کی طاقت

بھی تھی اس نے اپنی شخصیت کی خیر اسی اعزاز میں کی تھی جس میں اس کے باپ نے اس کی ماں کو دیکھنے کی خواہش

کی تھی اور پھر یہ۔ یہ شعوری کوکوش تھی لہذا اس سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ خود اتحاد بننے کی کوشش کرتے کرتے

وہ ضرور اور بہت دھم ہو گئی تھی۔ اسے امدادوں میں مضبوط بننے سے وہ مضبوطی اور خود سر ہو چکی تھی، دشمن بنایا

مظاہرہ کرتے کرتے بے راہ روی ہوئی تھی اور اسی ضرور، خود مری اور بے راہ روی نے اسے چابی کے گھاسے

لاکڑا کر دیا تھا۔

رفنا مراد سے فوری طور پر نکاح کر لینے کا فیصلہ اس نے اپنی خوشی اور مکمل رضا مندی سے بڑھ کر

کیا تھا، اسے ایسا کرنے پر چند ہنگامہ جو بہتات نے مجبور کیا تھا، چند لمحوں کی نفوذ نے اس کے غور کے برابر

ڈالے تھے اور وہ کسی بے دم بھٹی کی طرح اس کے دامن میں گر گئی تھی۔ ایسے وقت میں جب رضا نے فوری فیصلہ

نکاح کی پیشکش کی تو وہ انکار نہ کر سکی اور وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں تھی بھی نہیں، سب کچھ اتنی جلدی اور ایک

ہوا تھا کہ اسے سوچے، سمجھنے اور پھینکنے کی مہلت ہی نہ ملی اور اب وقت آپڑا تھا سوچے کا جو کچھ بیت چکا تھا

سمجھنے کا۔

اسے احساس ہو رہا تھا کہ اب تک ہر کام بہت فیصلہ منطقی اعزاز میں کرتی آ رہی تھی۔ وہ جو فکریات

غیر جذباتی اور حقیقت پسند سمجھتی تھی جسے سما کی روحان پسندی اور تازک خیالی سے کوفت ہوئی تھی۔ وہ جو الہام

اور راشدہ سودر پیاں کو لکھ اعزاز کرنے کی ہرگز قائل نہ تھی۔ شاید کھانے کا سودا کر رہی تھی۔

اسے اپنے مضبوط احساس پر تاز تھا لیکن کچھ دنوں سے اس کے شانے نوٹنے لگے تھے۔ اور انہیں

صحن محسوس کر رہی تھی۔ دل پر ایک عجیب سے بوجھ کا احساس تھا۔

راشدہ بیکم کو گھر آئے دونوں ہو چکے تھے اور انہوں نے اس سے ملنا تو درگاہ اس کی صحت دیکھنے

انکار کر دیا تھا۔ گھر کے دیگر افراد بھی اس سے کترائے کترائے سے پھر رہے تھے اور ادھر ادھر کا کچھ پتا نہیں تھا۔







مری صاحب نے کرسی کی پشت سے ایک نکالی۔ اللہ کرنا ہے اسے اچھے کے

آپ کہیں احتیاط کرنا ہیں کہ علی الاطلاق باہمی چپکے رائے۔  
مذاہق ہو کر اکتفا نہ کیجئے۔

[illegible]

میں۔ ان کی نظریں ایک بار ہی جھٹکتی تھیں۔  
 "جھٹکتی ہو رہا آپ نے جو کچھ کہا۔" وہ میری آنکھ میں آ گیا۔

”خود تامل کر ماورے میں نے آپ سے کہا تھا کہ اگر آپ مجھ سے ایسا نہ کریں تو ہم کا مسئلہ خیر کر سکتی ہیں۔  
میں اس مطلب پر شک نہیں ہے کہ میں کوئی بہت قاصر، فاقہ مختص ہوں جس کے پاس مدد صرف ان کی زندگی میں چھانکنے اور  
لفظ الفاظ کے ساتھ اور کوئی کام نہ ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں بہت کم لوگوں کو خود سے قریب کرنے کی ایلاوات  
رہا ہوں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ علیحدگی جن کے بارے میں نہ صرف جانتے ہوں بلکہ بہت زیادہ جانتے ہوں کہ

۱۰۰ گنہگار

بہار کا دل مجھ پر انداز میں دھڑکا تھا۔

”آپ کا شروع کیجئے۔“ وہ چہرہ خاص اٹھائے۔ ”آپ کو کبھی کسی قسم کی لڑائی پر مشاطا نہیں کیا؟“

تھیں۔ وہ اپنی بیٹ کی جانب بڑھتی گئی۔

۱۰۰ ..... الملائکۃ سے کیا سوٹ ہوئے خدائوں میں تقوا۔ رحم دلی دینی آوازوں میں جتنی حق پرستی ہو

۱۵۷۲

آیت قرآنیہ ..... در جملہ کی۔

والله اعلم

ہذا کہ سے کام لے لائن لائن صحت پر مبنی طرح مرضی سے اسے ایسا بھی بنے ایک بہت ہی بڑا مسئلہ۔  
 "میں نے انکار کرنے کا ایک قوی بڑا نقصان ہے۔" "میں نے جملہ جملہ"۔ ایک قوی بڑا مسئلہ کی طرح  
 "میں نے انکار کرنے کا ایک قوی بڑا نقصان ہے۔" "میں نے جملہ جملہ"۔ ایک قوی بڑا مسئلہ کی طرح

مدرسه علمیه و کتبخانه

[illegible]

سید محمد علی کریم

صاف خوشی میں آپ نے مجھے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

”ہاں شہرِ رُوزِ دہ“ وہ طوطا کہہ کر غوغا مچا دیا۔ یہی خبر پہلے ہی اسی جوں جوں کہ اگلے خبر پہ پہنچا۔  
 سناٹا دھڑکن کو کھینچنے کا ذوق ہی نہ تھا کہ کس طرح لپکتا ہے حالانکہ وہ خود سے بھی کہہ کر ناگوار لگتا ہے۔  
 ہمیں تھی انتہا پر، بھائی کے علاوہ جس بھی شخص کو پسند نہ کی نظر سے نہ دیکھ پاؤں گی جس کی طرف اشارہ کیا  
 جیسے کہتے ہو وہ اہمال باقی نے چند دنوں میں ہماری زندگی کا تصور ہی بدل دیا ہے۔ وہ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ  
 عزیز سے بھی برا ہو چکا ہے۔ ”مہ“ میں اتنی خوش حال شہرِ رُوزِ خوشی سے مر جائے کوئی جاہل نہ  
 وہ نہ کھولے، حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا جیسے جو کچھ سنا ہو، وہ اس کے لیے دنیا کی سب سے اونگھی  
 سحر آواز کہہ رہے وہی بات ہو۔

“*Yes*”

”ختمی۔“ وہ خود پر قہار پائے ہوئے بولتا ”اسوں کیوں اور کس پر کھٹے تو خوشی ہوئی مسلمانوں کو؟“

وہ بیتیہ خوش ہوتا چاہتا تھا، لیکن اس کے اعدا اس کے بھائی کا کام بادل رہا تھا۔ جس کی آواز انا بھائی تھا۔  
صاف تھی۔ مسلمان میں چھپ کر لانے کے پانے اس کے سامنے سے ہوتی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھوں کی

۱۱۱۔ "نظر ایں جھکے" یعنی "مجھے آپ سے ہمو کرنا ہے۔"

”جی ہاں۔“ انہوں نے قائل بن کر رکھی ”کوئی خاص بات ہے کہ اس عمل کی بہت آہستہ ہے۔“

سربراہ ذرا لا جاؤں صلیب مجھے کچھ عرصے سے تک کر رہی ہیں وہ مجھ سے عجیب و غریب محکمہ

آپ! جس سے میں کونف کا شکار ہو جاؤں آپ ملزائن سے کہہ دیں وہ مجھ سے بات نہ کرے گا

上

وہ کسی دین سے زلزلہ کے روپے کے بارے میں عراقی عجمائی سے بات کرتا تھا۔

مرے لئے ہے۔

میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔

وہی ہے جس نے "عشق" سے پہلے

عزیز مہاشی صاحبہ گرامی۔

”ہمکلمات ہے کہ علی ایک ایسی ہی صفت ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔“

۱۰۰  
الایام جری کر: حضرت پ دین: میرا جبراً حالاً ادا۔



”آؤ اندر پھا کر پڑیں کتنے کا ہے۔“ وہ اسے لے کر دکان کے اندر دھس گئی۔

غزالہ کی شادی کی تہنیت نزدیک آ پہنچی تھی۔ اور ریشم نے دن رات اس کی جان کھائی ہوئی تھی۔

آج وہ آفس سے جلدی چھٹی کر کے اسے مارکیٹ لے آئی تھی۔

دکان دار نے سوٹ کی جو قیمت بتائی۔ اسے سن کر ریشم نے اسے مارکیٹ لے آئی تھی۔

”سن لیا؟“ اس نے ریشم کی سمت دیکھا۔

”بہت بھگتا ہے بھو! کہیں اور پھا کر پڑیں۔“ اس نے اپنی سے گردن ہلائی۔

”دووں دکان سے لگیں آئیں۔“

دکان دار کو تھامی۔ مبادا ریشم اپنا مادہ ایک بار پھر بدل ڈالے۔

”پتا نہیں بچا چیزیں اتنی مٹھی کیوں..... ہوتی جا رہی ہیں۔“ ریشم اپنا ہندوہ سوٹ نذر پیا نے ہ

خفت اداں تھی۔ ”آخر ہم لوگ غریب کیوں ہیں؟“

”بکومت اور عدا کا شکر ادا کیا کرو۔“ ریشم نے اسے جھڑکا۔

شام گہری ہو رہی تھی اور وہ رکشے کی تلاش میں تھی۔

اپنا ایک ایک گاڑی ان کے پاس آ کر رک رہی، اور ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھے شخص نے شیوہ انداز کہا

”بھلا۔“ ریشم نے کہنی مار کر رکشے کی تلاش میں نظریں دوڑوائی تو متوجہ کیا تھا۔

”بھو!۔“ وہ چونکی۔

گاڑی میں عبا صاحب اس کی سمت متوجہ تھے۔

”سر آپ۔“

”آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“

ان کا انداز اس قدر تھیں تھا کہ ریشم انکار کر رہی نہ پائی، اس نے ریشم کو بیٹھے کا اشارہ کیا۔ دونوں بیک

جھکی بیٹ پر بیٹھے تھیں۔

”تو شاہجک ہو رہی تھی.....“ گاڑی آ کے بڑھا کر سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

”جی سرائیو میری چھوٹی بہن ہے ریشم۔ اسے کپڑے دلوانے لائی تھی کچھ دن بعد اس کی قرینا رحمت

کی شادی ہے۔“

”آپ نہ بھی بتا نہیں تو دیکھنے والا خود بخود آپ کا رشتہ سمجھ سکتا ہے شکلیں ہی اس قدر مظاہر ہیں۔“

دھیرے سے بولے ”اور بیٹا آپ کیا کرتی ہیں؟“

”میں نے انٹر کا انعام دیا ہے، روز لٹ آ جائے تو یونیورسٹی میں ایم اے کر رہی ہوں۔“

”بہت خوب۔“ وہ مسکرائے۔

گاڑی ایک ریسنورٹ کے سامنے جا رہی تو ریشم بری طرح صبر کر گئی۔

”کھ..... کیا؟“

”کچھ بھی نہیں، آپ کے لیے تو کچھ بھی نہیں، البتہ یہ جو پیاری سی لڑکی آپ کے ساتھ ہے ل

آئسکریم کھائی ہے کیوں بھی ریشم کھانی ہے نا آئسکریم۔“

ریشم مسکرا دی۔ مبادا ریشم کو گاڑی سے اترنا پڑا، اسے یہ سب کچھ نہایت برا محسوس ہوا تھا جب ک

”آؤ اندر پھا کر پڑیں کتنے کا ہے۔“ وہ اسے لے کر دکان کے اندر دھس گئی۔

غزالہ کی شادی کی تہنیت نزدیک آ پہنچی تھی۔ اور ریشم نے دن رات اس کی جان کھائی ہوئی تھی۔

آج وہ آفس سے جلدی چھٹی کر کے اسے مارکیٹ لے آئی تھی۔

دکان دار نے سوٹ کی جو قیمت بتائی۔ اسے سن کر ریشم نے اسے مارکیٹ لے آئی تھی۔

”سن لیا؟“ اس نے ریشم کی سمت دیکھا۔

”بہت بھگتا ہے بھو! کہیں اور پھا کر پڑیں۔“ اس نے اپنی سے گردن ہلائی۔

”دووں دکان سے لگیں آئیں۔“

دکان دار کو تھامی۔ مبادا ریشم اپنا مادہ ایک بار پھر بدل ڈالے۔

”پتا نہیں بچا چیزیں اتنی مٹھی کیوں..... ہوتی جا رہی ہیں۔“ ریشم اپنا ہندوہ سوٹ نذر پیا نے ہ

خفت اداں تھی۔ ”آخر ہم لوگ غریب کیوں ہیں؟“

”بکومت اور عدا کا شکر ادا کیا کرو۔“ ریشم نے اسے جھڑکا۔

شام گہری ہو رہی تھی اور وہ رکشے کی تلاش میں تھی۔

اپنا ایک ایک گاڑی ان کے پاس آ کر رک رہی، اور ڈرائیو تک سیٹ پر بیٹھے شخص نے شیوہ انداز کہا

”بھلا۔“ ریشم نے کہنی مار کر رکشے کی تلاش میں نظریں دوڑوائی تو متوجہ کیا تھا۔

”بھو!۔“ وہ چونکی۔

گاڑی میں عبا صاحب اس کی سمت متوجہ تھے۔

”سر آپ۔“

ان کا انداز اس قدر تھیں تھا کہ ریشم انکار کر رہی نہ پائی، اس نے ریشم کو بیٹھے کا اشارہ کیا۔ دونوں بیک

جھکی بیٹ پر بیٹھے تھیں۔

”تو شاہجک ہو رہی تھی.....“ گاڑی آ کے بڑھا کر سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

”جی سرائیو میری چھوٹی بہن ہے ریشم۔ اسے کپڑے دلوانے لائی تھی کچھ دن بعد اس کی قرینا رحمت

کی شادی ہے۔“

”آپ نہ بھی بتا نہیں تو دیکھنے والا خود بخود آپ کا رشتہ سمجھ سکتا ہے شکلیں ہی اس قدر مظاہر ہیں۔“

دھیرے سے بولے ”اور بیٹا آپ کیا کرتی ہیں؟“

”میں نے انٹر کا انعام دیا ہے، روز لٹ آ جائے تو یونیورسٹی میں ایم اے کر رہی ہوں۔“

”بہت خوب۔“ وہ مسکرائے۔

گاڑی ایک ریسنورٹ کے سامنے جا رہی تو ریشم بری طرح صبر کر گئی۔

”کھ..... کیا؟“

”کچھ بھی نہیں، آپ کے لیے تو کچھ بھی نہیں، البتہ یہ جو پیاری سی لڑکی آپ کے ساتھ ہے ل

آئسکریم کھائی ہے کیوں بھی ریشم کھانی ہے نا آئسکریم۔“

ریشم مسکرا دی۔ مبادا ریشم کو گاڑی سے اترنا پڑا، اسے یہ سب کچھ نہایت برا محسوس ہوا تھا جب ک

آؤ اندر پھا کر پڑیں کتنے کا ہے۔“ وہ اسے لے کر دکان کے اندر دھس گئی۔

غزالہ کی شادی کی تہنیت نزدیک آ پہنچی تھی۔ اور ریشم نے دن رات اس کی جان کھائی ہوئی تھی۔

آج وہ آفس سے جلدی چھٹی کر کے اسے مارکیٹ لے آئی تھی۔



”ایک قسم چٹھک کر رہے ہیں کہ آیا کپڑوں پر کیا کیا کام کی جتنی ہی ہے یا اور یہ دونوں سے ال ضرور کو اوتا ہے اور یہ کہ درزی نے سلامتی میں صفائی اور غصہ کیا کیا معیار رکھا ہے۔ کہیں ٹوکی والوں کے ماتھے پر صند نہ ہوتا پڑے۔ اور تم کارخانہ طرہ پر کی جانے والی اس خدمت پر یہ صلہ دے رہی ہو؟“

چاہتے تھے، پھر جو کچھ بھی ہوا، اسے قسمت کہہ دیں، خدا نے تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ آپ کی زندگی میں جو کچھ شامل ہو جائے، لیکن اگر ایسا ہو ہی گیا ہے تو اسے مجھڑائے چلے جاتا کہاں کی عقل مندی ہے؟ یہ سچ کہہ رہی تھی کہ آج تک میں نے بھی شخص نہ دیکھا اور بے وقوفی کے مظاہرے کیے ہیں۔ لیکن اب مجھے یہ



297  
 کی دوا کا نام رکھا  
 "الاس کا شہر ڈاک کر دی گئی۔ ہر بار ایچ ڈی ان کے کوئی۔ آج ہر اس کے اس کے"۔  
 پتائی دے

کرنا ہے، ذرا دل دے۔  
بجز عظیم اور دقتیر صاحب کسی عزیز کی صحبت کے لئے مجھے ہونے سے لارور مکرو میں اگلا تھی۔ پہلے  
میں نے شہرہ کو بلائے گا سوچا پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ چنانچہ میں ایک جہان ٹرانس کے کا آئے کسی کو بھی متنبہ  
نہ کیا تھا۔ اسی خیال نے اسے شہرہ کو بلا دینے سے باز رکھا۔ پھر اس نے الماس سے پہنکھ کی پوشش کی کمراس  
لی تاکہ اسے ہر کسی سے چھپا سکیں۔

میں نے ان کا نام پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ان کا نام احمد ہے۔ ان کا تعلق ایک گھرانے سے ہے جو کہ ایک بڑے مالدار اور زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے والدین کا نام احمد ہے۔ ان کے والدین کا نام احمد ہے۔ ان کے والدین کا نام احمد ہے۔

”امی ابو اتنی جلدی آ گئے۔  
اُنھ کر میٹ کی سمت دوڑ گئی۔

وہ انھو کرکیت کی سمت دوڑ گئی۔  
اسے اس وقت نچر اور ترقیر صاحب کے علاوہ کسی کے مینٹ پر موجود ہونے کی توقع ایک فیصد بھی نہ  
ہو سکتی تھی۔ وہ چھٹوں کے لیے کچھ بلان بھی  
نہ کیا۔

نورادر نے ایک نفاذ اس کے حیرت زدہ و جزد پر اور دوسری گھبراہٹ میں سر پہ پر ڈالی تھی۔  
 ”آپ کی حیرانی نے تو مجھے ڈرای دیا“ پھر وہ مسکرا کر کہہ بلا۔ ”میں سمجھا، جلدی میں میں ہی مجھ کو  
 پکارتا تھا۔۔۔ جنت کی شکل نورادیا کی ایک انکار ہند۔“

مباحثہ: جہنم کڑ مسکرا دی۔

”تمہارے پر پابندی تو نہیں ہے؟ آپ اس طرح رستہ روکے کھڑی ہیں جیسے انکی جگہ کسی دوسرے کو دینا ہے۔“

”وہ دراصل۔ اہی ابوبکر نہیں ہیں۔“ اسی نے قدرے بچکے ہوئے وضاحت کی تھی۔

”یہودی“ وائٹل نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا۔ ”اس سے اچھی بات۔“

دو منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا تھا۔ صبا چور کی بات سن نہ پائی۔

“23”

"بیمارِ معطل ہے۔ میں انتظار کر لیتا ہوں۔ اگر آپ اندر نہ جانا چاہیں تو میں کھینٹ ہوں۔"

”جنتی کا شمار ہوگی۔“

”نہیں۔ آج۔ امیر آج۔“ ”محکمہ فضلہ، پہنچ کر اس نے کہا۔“ اکی، اب آج آج ہی اس کے۔“

”عزیز! یہی خیال ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”میں نہیں کہہ سکتی ہوں۔ آپ کا بڑی انداز کر رہی ہیں۔“  
 باہر اس کی چھتائی چھڑی کود کر کچھ کر سکا کو خال آ گیا تھا۔

۱۰- ایک بے پناہ قوت رکھنے والی۔

[illegible]

296

اگر میں غصہ آ گیا تو ہم در حقیقت سنا دیں گے کہ ہم ان کو

اک دیا ہوئے رکنا

ہمارے کام کو کھراوا اور چلاوا اور ہم اس سے روکی ہوئے۔

”

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

”اور میں خبر آگیا تو کم یہ سب چھوڑ چھاڑ کر چلے جا میں کے بارہوی خانے میں۔ مگر میرے پاس ابھی باقی آتی اہل کی دیکھتے ہے۔ آتا گنوا کر روٹیاں بھی ڈالتی ہیں میں۔“

”جو منافق کیوں نہیں کہہ سکتی کہ میں صیاح شہزادہ جا کر آتا ہوں اور وہاں وہاں ملے۔“

”سے لے لیا ہم نے کب ایسا کھلا۔“

”ابھی یہی تو کہہ رہی تھی۔ آئے وہ ای حضور کو، آج تم تہاڑی شکایت لگاؤں گے کہ جہاں ابھی

”جنتا نے سر جھٹکا۔“ جیسے باہمی تو ہمیں جانتی ہی نہیں۔“

”یہ بھی سوچ کر وہ ایک ہاں میں۔ جب اپنے سب سے چھوٹے، لاڈلے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو  
 تھیں تو ان کے دل پر کسی بد چھپاں سی طغیانی۔ ایسے میں انہیں کہاں کچھ بھانپ دے گا۔ وہ تو گن گنا ہی  
 کرتا رہا کہ ان کو ہم ان سے کہیں گے۔“

خدا طرطان سے کپڑے تہہ کر کے اٹھی کس میں رکھی رہی۔

ہم اپنی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا دیکھ کر اسے سخت افسوس ہوا تھا۔ وہ بلا مقصد اور اور اچھے لکھنے والا

تو مجھے ہوتا کہ بڑا صلی لڑو۔ جتنا نے اسے شہر دیا۔

”تھیں کس نے کہا تم فالتو بیٹے ہیں۔“ وہ سخت بھڑایا۔

”الو! میں کہتا نہیں ہے کیا۔ ہانگ پر ہانگ دھرے بیٹھے ہو۔ کیا پٹا اڑھو اور ہے ہو۔“

سید صاحب رحمہ فرماتے ہیں کہ جناب برپا کر دینے والے خیالات کی اہمیت میں

”وقف ہوئے ہیں۔“

اے بوٹنی بولے جاؤ گے۔۔۔ اس نے سر جھٹکا۔

تمہاری مدد کریں تو تمہیں اعتراض - خاموش ہو بیٹھیں تو تم سکھ جیں۔ کچھ بولنے کی کوشش کریں اور

ترکی ہے کہ ہم یہاں سے اٹھ جائیں۔“

انٹرنیٹ پر کھڑا ہو گیا۔

اے طے کہاں۔۔۔ یہ کہی ہم نے نہیں اُٹھنے کے۔ ہم نے کپڑے تہہ کر کے رکھ دیے ہیں۔ یہ دیکھنا

استخدم على ركعتين

مختار نے تسلیم کر لیا کہ ہمارا وعدہ کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں۔ ”دیکھو۔“

آوے سے فریاد کرتا کہ اے خدا، کیا تیرے پاس اسٹوریوں میں رکھنے والی باتیں ہیں؟

[illegible]

۱۰۲- در بیان حیات میں دو عالم ہیں۔

یہاں کی عورتیں بھی۔۔۔ وہاں کی عورتیں بھی۔۔۔

2



کھینچے گئی۔ ساتھ ساتھ دوسری بھی جاری تھی کہ چائے کے ساتھ کیا پیش کرے۔

”پیلو۔“ کسی نے پیرم سروں میں کہا تھا۔

”وہ اپنی سوغ میں تم بھی ڈر کر زور سے اچھلی۔ سامنے شہر زور کوڑا سکر رہا تھا۔“

”اچھے پھلے جیتے ہو تم؟“ وہ بھنائی۔ ”ہل بھر میں سامنے آکر کھڑے ہو چائے ہو جیسے ہارو کے زور پر

چلے آئے ہو۔“

”ساری بات خیالات کے حسن کی ہوتی ہے۔“ وہ کچھ کھانے کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ”اور آپ مجھے فرشتہ بھی سمجھ سکتی تھیں۔“

”فرشتوں کی شکلیں ایسی ہوتیں تو لوگ مارے خوف کے عبادت کرنا چھوڑ دیتے کہ کہیں کوئی فرشتہ چلا آئے۔“ وہ فحشی۔

اس نے لا جواب ہو کر برا سا منہ بنایا تھا۔

”شہر زور میاں بالکنا ہے آدمی تم اچھے ہو۔“ وہ خود سے مخاطب تھا۔ سارا زمانہ تمہارا دوشن ہوا چائے ہے۔“

مبارزہ سے ہنس دی۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ چوٹی تھی۔ کچن کے دروازے پر دانیال ہانپی کھڑا تھا۔

”آپ نے کہا تھا کہ آپ گھر میں اکیلی ہیں۔ مراد نہ آواز سن کر میں یہاں چلا آیا۔“ دو غنات

کرنے لگا۔

”شہر زور ہے۔ بڑوں میں رہتا ہے۔ یہ بالکل برابر والا کھراں کا ہے۔“ صبا نے تعارف کر دیا۔

”اور شہر زور ایہ دانیال ہیں۔“

”اوہ تو آپ ہیں دانیال ہانپی؟“ شہر زور نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ ”بھئی بڑی تحریر نہیں تھی آپ

کی۔ ایسا لکھا تھا کہ مچھلی میں مٹھائی کے بجائے تریشوں کے ٹوکے آئے ہیں۔“

”واقعی؟“ وہ سکرایا۔ ”یقین کرنے والی بات تو نہیں۔ ہانپی دادو، یہ تو تریشیں کس سمت سے بنی

تھیں کچھ ہاتھ پیر ہے۔“

”شہر زور؟“ صبا جلدی سے بول پڑی۔ تم ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔ میں چائے دیتا ہوں۔

آتی ہوں۔“

”آئیے دانیال صاحب! صبا کی برائیاں کرتے ہیں۔“

”وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ صبا دل ہی دل میں دعا نہیں مانگتے تھی کہ شہر زور کچھ لٹائی

سیرم نہ پہنچنے لگے۔ اس سے کچھ پیچیدگی نہ تھا۔

جلدی جلدی چائے بنا کر میٹکس کی پلیٹ ساتھ لیے وہ اندر آئی تو دونوں کئی بات پر ہنس رہے تھے۔

”دیکھا آپ نے۔ منوں میں چلی آئیں کہ کہیں ہم دونوں ان کے خلاف کوئی بات نہ کر دیں۔ وہ۔“

”عینا ان کی چائے گھونٹ بھر میں تیار ہوئی ہے۔“ شہر زور چپک کر بولا تھا۔

”ہاں ہاں خوب بول لو۔“ صبا نے اسے گھورا۔ ”تمہیں تو خدا نے موقع دیا۔“

”بہلے پکڑنے کا۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا۔ ”ورنہ ہوتا یہ ہے مجھ اکیلے کے خلاف کئی خواتین ایک وقت کر

بت ہوئی ہوتی ہیں۔ آج آپ اکیلی ہیں تو ذرا مجھ پر اکڑو۔ پیشہ گزرنے والی کیفیات کا اندازہ کر دیں۔“

”فحشی! ظلم ہے آپ کے ساتھ۔“ دانیال سکرایا تھا۔ ”کمر بستہ ہونے کے لیے ایک فائدہ غارت خانہ لائی

ہوتی ہے اور آپ خواتین کا مقابلہ کرتے ہیں۔“

”نہ صرف مقابلہ کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنی جتنی جسں زبان سے سب لوگست بھی دے دالتے

۔“ دانیال کی صلاحیتوں کا ناظر، راجست نہ کریں۔“ صبا بولی۔

”آپ ان کی صلاحیتوں کا تو میں بھی محرف ہو گیا ہوں۔“ دانیال ہانپی نے غور سے مبارک دیکھا۔ ”آپ ہی کم

نہایت بولنے پر مجبور کیا ہوا ہے۔ ورنہ تم ہر بار ہمارا کام ہی لوٹے ہیں۔“

”مبارک کر رہا ہوں۔“

”تم کو؟“ اور ”غارت خانہ؟“ شہر زور تیرت زورہ ٹھہر آئے میں صبر فرما تھا۔ ”دو قیامت حقدار خصوصیات کر

کنا ہے کیا آپ نے؟“

دانیال زور سے ہنس دیا۔

”میں کریں۔ اپنے اپنے تجربات کی بات ہے۔ میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی رائے

مبارک ہو۔“

”چند دن گزرنے دیں۔ پھر آہستہ آہستہ آپ کی رائے بھی بدلے گی۔“ شہر زور نے سر ہلا کر گویا اسے

لمبا لگا۔

صبا چائے میں جتنی ملا تے ہوئے مسلسل اسے کھور رہی تھی۔

لمبا لگا۔

•••••

”دست موصول تھی ہارنی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ دھماکے سے اندر قدم رکھتے ہی سن ہو گئی۔ مچن

نہال کے پاس شہر زور بھی ہوئی تھی۔ دونوں نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا مگر دونوں ہی خاموش رہیں۔

”شہر زور؟“ وہ خود ہی آگے بڑھی۔ ”کب آئیں۔ کسے ہو؟“

”دیکھ میں آئی تھی۔ ٹھیک ہوں۔“ اس کا انداز حد درجہ بیچکا تھا۔

”نہلم پر کوئی شرمندگی اور عداوت کی براف ڈالنے لگا۔ اس کا جسم بالکل خشک ہو گیا۔“

”شہر زور؟“ وہ اس کے ہاتھ تھام کر پیچھے مکی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تاں تمہاری؟“

”جی بھریا؟“ اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکالا تھا۔ ”میں بالکل ٹھیک

ہوں۔ بہت خوش۔ آپ کپڑے بدل لیں۔“

”کپڑے بدل کر دیکھوں، یہ میرا اور شہر زور ہارنی غانے میں کسی کیا کر رہی ہیں۔ کچھ پکاؤ رات کے

لے ہو سکتا ہے پوسٹ میاں بھی یہیں کھانا کھا کر گئے۔“

”دونوں جیسے اس کی ماں اور بہن نہ تھیں۔ وہ جیسے ان دونوں کی کچھ نہ لگتی تھی۔ کس قدر اچھی، کتنا

پایا جان کا انداز۔“

”وہ اٹھ کر کمرے تک آئی لیکن اسے لگتا تھا اس نے صدیوں کا سفر کیا ہو۔ حیدوں میں چلے پھلے پھلے

کھان اور زبان میں کانٹے اک آئے ہوں۔ کانٹے سے احساس ممکن ہے ٹوٹ چکے ہوں، دل احساس تھالی میں

لگا ہوا چائے ہو۔“

”نہلم کسی کام سے کمرے میں آئی تو وہ آنکھیں بند کیے، دیکھو کارا سہارا لیے کھڑی تھی۔

”بھریا؟“ وہ گھبرا کر آگے بڑھی۔ ”بھریا ہوا ہے؟“

”اس نے پھل لٹائی میں سر ہلا دیا۔“

”مجھ باندھ نہیں بھر۔ میں پانی لائی ہوں۔“

”نہلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔“



سہری بات سنیں جو کہ۔ جو کہنے کے لیے میں بنانے کب سے بے محنت ہوں۔" نجم نے اس کی بات سن کر کہا: "جیسے عوام میں، ہوسٹ اور آپ۔" علیحدہ علیحدہ دکانوں میں بیٹھے ہیں اور اپنی اپنی چٹائی پر لیٹے ہیں۔ "جیسے عوام میں، ہوسٹ اور آپ۔" علیحدہ علیحدہ دکانوں میں بیٹھے ہیں اور اپنی اپنی چٹائی پر لیٹے ہیں۔ "جیسے عوام میں، ہوسٹ اور آپ۔" علیحدہ علیحدہ دکانوں میں بیٹھے ہیں اور اپنی اپنی چٹائی پر لیٹے ہیں۔

نجم نے وہیں انھوں سے سر قلم لیا۔

"ہوسٹ نے مجھے میری آواز کی قیمت تمہارا آواز بتائی ہے۔ اگر تم انہیں اپنا وقت دے دیتے تو مجھے پتہ چلتا کہ وہ کتنے گھڑوں پر چلتا ہے۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم۔" نجم نے اس کی بات سنی۔ "نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"

"نجم کو پتہ آئے گا۔"



کر مجھے ان سے نفرت ہو چلی ہے۔“

”میری مجبوری یہ ہے جو کہ میں نہ ان سے نفرت کر سکی نہ آپ سے۔“ وہ سنجی سے بولی تھی۔ ”لو ان سے آپ کی یہ نفرت اب میرے کسی کام نہیں آسکتی۔ ہاں، اگر آپ کو اب بھی ان سے محبت ہوتی تب دوسری بات تھی۔“

”میں۔ میں۔ یوسف سے بات کروں۔“ نیلم نے بولنے کی کوشش کی۔  
شبم کے انداز اس کے الفاظ کا گلا گھونٹے دے رہے تھے۔

اس عنایت کا شکریہ ادا وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کالے پانی کی سزا مجھے آپ ہی نے سنائی تھی۔ اب اس سزا میں تھوڑی بہت ترمیم کے لیے آپ تردد نہ کریں۔ میری زندگی تباہ ہوتی تھی سو ہو چکی۔ یوسف سے آپ کی یہ نفرت دیکھ کر مجھے اس بات کا اور بھی یقین ہو چکا ہے۔“  
وہ کمرے سے نکل گئی۔ نیلم اندھیرے کمرے میں کسی غیر مرئی نقطے پر نظر جمائے تا دیر اسی کیفیت میں بیٹھی رہی۔

اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں مہیب خلا تھے، گہرا سناٹا تھا۔ اور کوئی اس کی آواز سننے والا نہ تھا۔ احساس تنہائی اس کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ احساس جرم روح پر تازیانے برسا رہا تھا اور گھائل سوچوں کی میچائی کے لیے کوئی نہ تھا



”اتنی سی عمر میں کون کون سی پریشانیاں خود پر سوار کر بیٹھی ہیں؟“ فائل پر نظر جمائے وہ اپنی محسوس نجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

نیلم نے چونک کر سر اٹھایا۔

”جی؟ آپ نے کچھ کہا سر؟“

عباسی صاحب ہولے سے مسکرائے۔

”ٹائپنگ میں آج آپ نے اس قدر غلطیاں کی ہیں۔ مس علی کی میں چاہتے ہوئے بھی ٹھہرائی

کر پار ہا۔“

”اوہ! وہ انگلیاں چٹانے لگی۔“ دراصل آج میں کچھ۔ سر درد محسوس کر رہی تھی۔“

”ابھی کچھ دیر قبل میں نے اسی درد کے بارے میں استفسار کیا تھا۔“ فائل میز پر ڈال کر وہ مسکرائے۔

یہ درد اکثر ہوتا ہے آپ کے سر میں۔ کس قسم کا درد ہے مس علی؟“

”تیلی کفیووزی ہو کر نہیں دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا، وہ غصہ کر رہے تھے، مگر کر رہے تھے۔“

محض ایک مذاق تھا۔

”آپ ناراض ہیں سر!“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔ ”میں یہ سپرزد دوبارہ سے ٹائپ کر دیتی ہوں۔“

”جی نہیں۔ میرا خیال ہے آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ وہ منات سے بولے۔

”سر۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ان کا انداز اسے الجھا رہا تھا۔

”ابھی تو آپ نے کہا، آپ سر درد محسوس کر رہی ہیں۔“ وہ ہنس دیے۔ ”مس علی! میں آپ کو کچھ نہیں

سکا۔ ہمہ وقت ابھی ابھی، کھوئی کھوئی، جیسے کہیں کچھ رکھ کر بھولی ہوں، لا متناہی سوچوں کا شکار ہوں۔ اگر آپ

کے ساتھ کیا پراہلم ہے؟۔ مگر میں کوئی مسئلہ ہے؟۔“ نیلم پلکیں جھپکائے بغیر انہیں دیکھ رہی تھی۔



”میں آپ کے ساتھ تعاون کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا ہوں لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے آنسوؤں ہو رہا ہے کہ آپ میرے ساتھ بالکل تعاون نہیں کر رہی ہیں۔“  
آخر کار ان کے لہجے میں برہمی در آئی تھی۔ نیلم بالکل سکت بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر اس کی پلکوں میں ہلکی سی حرکت ہوئی اور دو آنسو اس کے گالوں پر آڑ کے۔  
”مس علی!“ عباسی صاحب چونک اٹھے۔ ”پلیز۔“

”نیلم نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ اڑھانپ لیا اور ہچکیوں سے رونے لگی  
”اوہ نو!“ وہ کرسی سے اٹھ کر اس تک آئے۔ ”مس علی! بھئی یہ کیا حرکت ہے۔“ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس کے چہرے سے ہٹائے۔  
”نیلم۔ پلیز۔“

وہ رونا بھول کر ان کی طرف حیرانی سے دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ تھامے، اس سے حد درجے قریب وہ اسے بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے۔  
نیلم کی نظریں بے اختیار جھک گئیں۔ دل آزر دگی کے جال میں نکل کر یکا یک عجب کیفیات سے دوچار ہوا تھا۔

عباسی صاحب نے جیب سے رومال نکالا اور آہستگی سے اس کا چہرہ صاف کیا۔  
”ناؤ ریلیکس!“ وہ نرمی سے بولے۔  
نیلم نے ہولے سے سر ہلایا۔ وہ اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گئے۔  
”اپنے آنسوؤں کے ساتھ آپ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتیں۔“ چند لمحوں بعد وہ مسکرا کر کہہ رہے تھے۔  
”اس قدر بے مول ہیں یہ آپ کے نزدیک۔ جب جہاں جی چاہا، گرا دیا۔“  
”یہ آنسو بھی میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں کرتے۔ جب جہاں جی چاہتا ہے اٹھ چلے آتے ہیں۔“  
شرمندہ کر دیتے ہیں۔“ اپنے ناخنوں پر نظر جمائے وہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھی۔ عباسی صاحب نے اسے دہچی سے دیکھا۔

”ایسے تو نہیں چلے آتے یہ آنسو بھی۔ بنا دعوت تو یہ کہیں نہیں جاتے۔ بھلا کیوں یاد کرتی ہیں وہ وہ کر انہیں؟“

نیلم نے شرمندگی سے انہیں دیکھا۔  
”کچھ کہہ دینے سے دل کا بوجھ آدھا ہو جاتا ہے۔ آزما لیجیے۔“ وہ لب کشائی پر مجبور کر رہے تھے۔  
”جانے دیجیے سر۔ نی بریک ہے۔ میں چائے بناتی ہوں۔“ وہ نظر چڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کونے میں رکھی الماری سے کب نکالنے لگی۔ کچھ دیر قبل جو لمبے آکر گزر گئے تھے، اب تک دل کی تہہ میں ہلچل سی جارہے تھے۔ زخم زخم وجود پر کسی کا مہربان لمس اب تک اپنی پوری حرارت کے ساتھ محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے برف ہاتھوں کو وہ اب تک کسی گرفت میں محسوس کر رہی تھی۔

وہ اپنی کیفیت میں گم تھی۔ اسے احساس نہ تھا کہ اس کی پتلی کمر اور اس پر لہرائی سیاہ ناگن سی چوٹی کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔ دو گہری، سیاہ آنکھیں اس کے وجود میں بیوست ہو رہی تھیں۔

”اُف! کس قدر خوبصورت کام ہے آنٹی۔“ صبا پوری توجہ اور دلچسپی سے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ ”یہ آئیڈیا کہاں سے لیا۔“  
”وہیں کٹیلانگز وغیرہ میں سے پسند کیا تھا۔“ عفت خانم مسکرائیں۔ ”شکر ہے تمہیں پسند آیا۔ میں تو



اس فکر میں تھی کہ مجھ بوڑھی کی پسند نہ جانے کسی کو بھائے گی یا نہیں۔ تمہیں کپڑے اچھے لگے تو یقیناً غزالہ کو بھی پورے آئیں گے۔ ہم عمر لڑکیوں کا مزاج تو ملتا ہی ہے۔“

”آپ کی پسند کا تو جواب نہیں۔“ صبا مسکرائی۔ ”اور آپ سے کس نے کہا۔ آپ بوڑھی ہیں۔“

”تو کیا جوان ہوں۔“ وہ ہنسی۔

”اتنی گریس فل پر سنائی ہے آپ کی۔ مجھے کوئی آپ سا بن جانے کو کہے۔ میں فوراً مان جاؤں۔“

عفت خانم ہنستی چلی گئی۔

”جمنابائی! بازار میں مکھن کے کیا بھاؤ ہیں آج کل؟ وہ جھولے میں لیٹا بظاہر کسی کتاب میں مگمگ رہا ہے۔“

وہیں سے آواز لگائی۔

”ہمیں کیا خبر۔“ جمنابائی میں مگن تھی۔ ”باجی سے پوچھو۔ آج کل یہی مارکیٹ جاتے ہیں۔“

”امی حضور کو تو ڈھیروں ڈھیر مکھن مفت ملا کرتا ہے۔ انہیں بھلا خریدنے کی کیا ضرورت۔“

صبا شرمندہ ہو کر کپڑے واپس سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔ عفت خانم نے اسے گھورنے کی کوشش کی جو اس کے چہرے پر جچی کتاب نے ناکام بنا دی۔

اس لڑکے کو کون پورا پڑ سکتا ہے۔“ وہ بھی بڑبڑا کر رہ گئیں۔

صبا کو ہنسی آگئی۔

”آنٹی۔ آپ کے رشتے دار وغیرہ کب آئیں گے؟۔ ہفتہ رہ گیا ہے مایوں وغیرہ میں۔“

”دعوت نامہ تو سب کو ڈالے ہیں۔ فون بھی کیے ہیں جہاں جہاں ہو سکا۔ اب دیکھو، کون کب آ رہا ہے۔ ہماری طرف سے تو سارے انتظامات مکمل ہیں۔ شکر ہے اس رب کا۔ اس نے توفیق بخشی۔“

”السلام علیکم!“ فیروز احمد نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ جیتے رہو!“ انہوں نے محبت سے بیٹے کو دیکھا۔ ”آگئے بیٹا۔“

”ہائیں! گویا ابھی بھی شک ہے۔“ کتاب کے پیچھے سے پھر آواز آئی تھی۔

صبا بمشکل ہنسی روک پائی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے فیروز احمد نے ایک نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”کتنا کام باقی ہے امی؟۔ کوئی پرابلم تو نہیں۔“ وہ ماں سے مخاطب تھا۔

”نہیں بیٹا! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ سارا کام بخوبی منٹ گیا۔“

”میں چلتی ہوں آنٹی اب۔“ صبا نے خود کو اس ماحول میں غیر مناسب خیال کیا۔ ”امی انتظار کریں ہوں گی۔“

”بیٹھو بیٹا! چائے پی کر جانا۔ جمنابائی بنانے ہی گئی ہے۔“ انہوں نے خلوص سے اس کا ہاتھ قلم کر

اسے پھر بٹھا لیا۔ ”شہروز! یہ سوٹ کیس اسٹور میں رکھ آؤ۔“

”میری یہ ڈیوٹی مزید کتنی مدت کی ہے امی جان؟“ وہ جھنجھلایا۔ ”صبح سے رات تک کوئی دس مرتبہ سوٹ کیس وہاں سے یہاں اور یہاں سے وہاں لے جاتا ہوں۔“

جوان آدمی ہو۔ کون سا گھس جاتے ہو۔ انہوں نے برا مان کر اسے دیکھا۔

”جوانی اگر اس مشقت کا نام ہے تو ہمیں آج سے بوڑھا خیال کیا جائے۔“ وہ سوٹ کیس اٹھا کر باہر

نکل گیا۔

صبا اور عفت خانم ہنس دیں۔ فیروز احمد نے بھی مسکرا کر بھائی کو جاتے دیکھا تھا۔

”میں دیکھوں کھانے میں کتنی دیر ہے۔“ انہیں دفعتاً دھیان آیا۔ ”ابھی تو جمنابائی نے چاول بھی نہیں کھائے۔“



اک دیا جاتا ہے۔ کیا کیا سمجھتی ہے دن بھر۔“

چل پہن کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ صبا بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ جن لمحوں کی کبھی وہ منتظر رہا کرتی تھی۔ آج کس قدر بھاری لگ رہے تھے۔  
”اور مس صبا!“ وہ یک بیک متوجہ ہوا تھا۔ ”آپ کیسی ہیں؟“  
”جی۔ ٹھیک ہوں۔“ اس نے سر جھکا لیا۔  
”خوش ہیں؟“

”عجب سوال تھا۔ نجانے اس نے کیوں اور کس ناتے سے کہا تھا۔  
صبا نے حیرانی سے پلکیں اٹھائیں۔

اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھا وہ بڑی سنجیدگی سے اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کے اپنے اندر کئی سوالات اُبھرنے لگے۔ وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔  
”خوش رہا کریں۔“ پھر وہ سر جھکا کر بولا۔ ”آپ کے چہرے پر مسکراہٹ بھلی لگتی ہے۔“  
صبا ایک بار پھر حیرانی سے اسے تنکٹے لگی۔ آج وہ اسے حیران کیے دے رہا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور بڑبیوں کی طرف بڑھا گیا۔

”کتنے گہرے ہوتے فیروز احمد؟۔ میری صداؤں کی رسائی تم تک اب ہوئی ہے۔ جب میں جواب آنے کی امید سے ہاتھ دھو بیٹھی ہوں؟۔ یا۔ یا۔ آج بھی یہ محض میری خوش فہمی ہے جو تمہارے ذرا سے اخلاق کو التفات کا نام دے رہی ہے۔“

شہروز نے اس کے چہرے کے آگے ہاتھ ہلا کر اسے چونکنے پر مجبور کیا تھا۔  
”اس گھر میں کوئی آرٹسٹ نہیں ہے۔ بے وجہ پوز بنا کر مت بیٹھا کریں۔“ وہ مشورہ دیتے ہوئے اس کے قریب بیٹھا تھا۔  
وہ جھینپ کر رہ گئی تھی۔

”جاؤ بیٹی! ساتھ خیریت کے ساتھ جاؤ، ساتھ خیریت کے آؤ۔ میں نے تو کبھی تم لوگوں کی پسند کے کاموں میں رخنہ اندازی کی کوشش نہیں کی۔ تمہیں اور شبنم کو ہمیشہ آمنہ سے بڑھ کر خیال کیا ہے۔“ وحیدہ چچی اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھیں۔

”جی امی!“ ثریا آہستہ سے بولی۔ ”ہمارے لیے بھی آپ ہماری ماں کی طرح ہیں۔“  
”ویسے تو یہاں بھی تمہیں کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ہم نے تو تمہیں ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی ماں نے بلوایا ہے تو چلی جاؤ۔ کچھ دنوں کے لیے۔ بہن بھائیوں میں رہو گی تو ذرا جی بھی بہل جائے گا۔“

انہوں نے پاندان کھول کر آگے کر لیا۔

”ثریا! تم کپڑے تو بدل لو۔ ریاض آتے ہی ہوں گے۔“ آمنہ نے کہا۔

”جی بھابی!“ وہ آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اے لو! ان کی اماں کے اطوار دیکھو۔!“

”اس کے باہر نکلتے ہی وحیدہ چچی نے جل کر کہا تھا۔  
”کبھی ہماری بچی کے بھی یہ دن آئے تھے۔ جھوٹے منہ نہیں کہا کہ دو دن ماں کے گھر گزار آؤ۔ جی گھبراتا



ہوگا۔ اب اپنی بیٹی کی باری آئی تو کیسے شاہوں کی طرح بلوا بھیجا۔ یہاں جیسے اس کو کھانے پینے کو نہیں ملتا تھا۔  
 ”آہستہ بولیں امی!“ آمنہ دبے لہجے میں بولی۔ ”سن لے گی ثریا!“  
 ”اے سنتی ہیں تو سنیں۔ میں کیا ڈرتی ہوں۔ جی لگتی کہتی ہوں۔ تمہاری شادی کو کتنے سال ہو گئے  
 کتنے دن چھوڑا ریاض میاں نے تمہیں؟ اپنی بہنا ایسی پیاری ہیں کہ ہر دوسرے دن کھڑے ہوتے ہیں ساہوکار  
 کے لیے!“

آہستہ آہستہ ہل کر وہ چلے بھنے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ آمنہ نے بے بسی سے شبنم کی طرف دیکھ کر  
 وہ بے نیازی سے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔  
 شبنم! بہن تم ذرا ثریا کا سوٹ کیس تیار کر دو۔ اس کے چند جوڑے اور ضرورت کا سامان رکھ دو۔  
 شبنم سر ہلا کر کھڑی ہو گئی۔

اوپر آ کر وہ ثریا کی الماری کے پٹ کھولے کھڑی تھی۔ بے دھیانی میں اس کے کپڑوں پر ٹکا ہوا  
 رہی تھی۔ کسی نے پیچھے سے اس کی چوٹی کو جھٹکا سا دیا۔  
 شبنم چونک کر مڑی۔

”آداب عرض ہے!“ ریاض بھائی کھڑے مسکرا رہے تھے۔  
 گرم گرم لہو اس کے پورے بدن میں دوڑ گیا۔  
 ”آپ!“ اس کے تیور بگڑ گئے۔ ”یہ کیا حرکت تھی!“  
 ”وہ!“ وہ کھسیانے ہو گئے۔ ”یونہی تمہیں ذرا چھیڑنے کے لیے۔ وہ سامان رکھ دیا ثریا کا!“  
 ”رکھ رہی ہوں!“ اس کا لہجہ ہنوز خشک تھا۔  
 ”ایسی بیگانگی سے کیوں بولتی ہو شبو! کبھی تو مسکرا کر بات کیا کر دو۔ آخر ہم بھی تمہارے اپنے ہیں!“  
 الماری سے ٹیک لگائے وہ انہی بے باک نظروں سے دیکھنے لگے۔ شبنم نے چند لمحے انہیں دیکھا۔  
 نجانے کیا ہوا۔ عجب خیال تھا جو بجلی بن کر دماغ میں گھوم گیا تھا۔ اور اس خیال نے اسے ایک طمانیت  
 احساس سے دوچار۔ وہ لگاوٹ سے مسکرا دی۔  
 ”آپ ایسی حرکتیں ہی کیوں کرتے ہیں۔ غصہ دلانے والی!“ چہرے پر مسکراہٹ بجائے وہ ایک  
 سے بولی۔

ریاض بھائی ایک لمحے کے لیے ہونق ہوئے کہ ان کا منہ کھل گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے مسکرائے۔  
 ”تو تم تھلا دو نا۔ کون سی باتیں تمہاری من بھاتی ہیں۔ ہم وہی باتیں کریں گے۔“ وہ کھلے  
 تھے۔ ”تم تو یوں بھاگتی ہو جیسے ہمیں چھوٹ کی بیماری ہو۔!“  
 ”خدا نخواستہ!“ وہ ہنس دی۔

”قسم خدا کی شبو۔ تم ہنستی ہوئی کیسی پیاری لگتی ہو۔“  
 اس کو ذرا سا مائل بہ کرم پا کر وہ ہوش و حواس سے دور ہوئے جا رہے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے  
 گھبراہٹی مئی۔

”خدا کے لیے ریاض بھائی! ہوش کی دوا کریں۔“ اس نے اپنے کاندھے پر سے انکا تھم جھاڑ  
 ”جائیں نیچے جا کر بیٹھیں۔ میں بیگ لے کر آتی ہوں۔“  
 ”ذرا جلدی آنا۔ منظر ادھورا لگتا ہے تمہارے بغیر۔“ ان کی باچھیں مسرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ جلدی  
 جلدی سیڑھیاں پھلانگ گئے۔



وہ جو انہیں جانتا دیکھ رہی تھی۔ الماری سے سر نکال کر اتنا ہستی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سکون  
اطمینان کی لہریں پورے تن من کو بھگوئے دے رہی تھیں۔ کب سے جلتے سلگتے دل پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑ رہی  
تھی۔ وہ بہت دیر تک کھڑی اس کیفیت کو محسوس کرتی رہی۔

وہ صوفے پر دونوں ٹانگیں سمیٹے بیٹھی تھی۔ سیاہ لباس میں، اس کا خفگی سے تپا تپا چہرہ بے حد نمایاں تھا۔  
دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے، گردن اکڑے ہوئے چبا رہی تھی۔  
”دیکھو بیٹی! فیصلہ تو تم کسی سے پوچھے بغیر، کسی کو کچھ جانے بغیر کر رہی چکی ہو۔ اس کے باوجود تمہیں  
الماس۔ بیٹی! کہ تم مجھے سیماب سے زیادہ پیاری ہو۔ نجانے کیوں ہمیشہ میں نے اوروں کی نسبت تمہیں خود سے  
قریب محسوس کیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تم میں میرے بھائی کی جھلک بہت نمایاں ہے۔“ وہ جھکے جھکے انداز  
میں کہہ رہے تھے۔

”کچھ بھی ہے چچا جان! جیسا کہ آپ نے کہا، فیصلہ میں کر چکی ہوں۔ اور پھر رضا میں کیا برائی ہے  
آپ تو اب تک اس سے ملے بھی نہیں!“

”وہ تو ٹھیک ہے بیٹی! لیکن بعض باتیں ملے بغیر بھی علم میں آسکتی ہیں۔ میں نے کئی جاننے والوں  
سے اس لڑکے کا پتا کروایا ہے۔ وہ قابل اعتبار نہیں۔ میں اس پر زور نہیں دیتا کہ تم عثمان سے ہی شادی کرو۔ لیکن  
کسی قابل بھروسہ شخص کو تو اپناؤ۔ تم نے نجانے اس میں کیا دیکھا۔“

”جو کچھ ہوتا تھا، وہ تو ہو چکا ناں چچا جان؟“ اس نے سر جھکا لیا۔

”ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ وہ دبی دبی زبان میں بولے۔

”تم ہامی بھرو تو کوشش کی جاسکتی ہے۔“

”کس بات کی؟“ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا تھا۔

دلاور خان گڑبڑا گئے۔ انہوں نے کبھی اپنی کسی بیٹی سے اس قسم کی گفتگو کا تصور بھی نہ کیا تھا لیکن یہ  
لڑکی نجانے کس بات کی قسم کھائے بیٹھی تھی۔ ہر کسی کو جھٹکنے اور شرمندہ ہونے پر مجبور کیے دے رہی تھی۔  
”علیحدگی کی!“ عاصمہ چچی نے شوہر کو سر جھکا تا دیکھ کر خچی سے کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ الماس نے پہلو بدلا تھا۔

”کتنے دن ہو گئے اس بات کو۔ اب تک وہ کسی سے ملے بھی نہیں آیا۔ آخر اس گریز کا بھی کوئی مطلب  
ہوگا۔ ابھر تمہاری بہن کے سسرال والوں نے دلہیز پکڑ لی ہے۔ ان کو بھی کوئی جواب دینا ہے۔ تم شخص اپنی ذات کو  
لیے بیٹھی ہو الماس! کچھ تو دوسروں کا بھی لحاظ کرو۔“ وہ بہت دنوں سے بھری بیٹھی تھیں۔ بولے بٹانہ رہ سکیں۔  
الماس نے خفگی بھری ایک نگاہ چچی پر ڈالی۔

”دھیرج عاصمہ۔ دھیرج!“ دلاور چچا نے ان کا ہاتھ تھپکا۔

وہ سر کو جھٹکا دے کر منہ پھیر کر بیٹھ گئیں۔

”بیٹی! ابھی وقت ہے۔ سوچ سمجھ لو!“ پھر وہ الماس سے مخاطب ہوئے۔ ”اگر پھر بھی تمہارا فیصلہ  
مقرر رہے تو اس شخص کو بلواؤ۔ اس سے کہو۔ بارات لائے اور عزت سے بیاہ کر لے جائے، ہم مہار کے سسرال  
والوں کو بھی تاریخ دیں گے۔“

”میں بتا چکی ہوں چچا جان! وہ ملک سے باہر ہیں اور میرا ان سے کوئی کامیابی نہیں ہو پارہا۔ چہ



روز کی بات ہے، وہ آتے ہی مجھ سے رابطہ کریں گے۔“

”ٹھیک ہے!“ وہ مایوسی سے سر ہلا کر کھڑے ہو گئے!“ اور بیٹی، ذرا اپنی ماں کی دلجوئی کیا کرے۔ روز اس غم کو لے کر بیٹھ گئی ہے۔“

”امی تو مجھ سے بات کرنا تک پسند نہیں کرتیں، مگر میں ایسا سلوک کیا جا رہا ہے جیسے میں اہمیت ہو گئی ہوں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں!“ انہوں نے اس کا سر تھپکا۔

”چند دنوں کی بات ہے، سب کے دل صاف ہو جائیں گے۔ یہاں سب تمہارے اپنے ہیں، تمہیں چاہتے ہیں۔“

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

”کس قدر مغرور اور خود سر لڑکی ہے۔“ عاصمہ چچی کمرے سے نکلتے ہی بولی تھیں۔ ”کسی کا لحاظ ہے نہ آنکھ میں رتی برابر مروت!“

”رہنے دو بیگم۔ بچی ہے!“

”بچی! غضب خدا کا۔ میں کہتی ہوں۔ خدا خواستہ اپنی سیما سے ایسی کوئی حرکت سرزد ہوئی ہوتی تو آپ شوٹ کر دیتے اسے۔ اس کے ناز اس طرح اٹھا رہے ہیں جیسے اس نے کوئی بڑا قابل فخر کارنامہ سر انجام دیا ہو۔ ہونہہ! یہ صلہ ملا ہے ہماری نیکیوں کا۔ خاندان بھر کا نام ڈبو دیا۔ گویے سے نکاح کر کے بیٹھ گئی۔“

”بیگم!“ وہ دبی دبی آواز میں چیخے۔ ”خاموش ہو جاؤ!“

”شکر ہے میرے عثمان کی زندگی خراب ہونے سے بچی۔ کوئی نیک سیرت بچی ملائے خدا۔“ وہ باز آئیں۔ بڑبڑاتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگیں۔

دلاور خان بھی ہارے ہوئے جواری کی طرح ایک ایک سیڑھی پار کر رہے تھے۔



اپنی سوچی سوچی آنکھوں کو بار بار جھپکتی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ ریشم نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”تم پر تو ابھی سے نور اترنا شروع ہو گیا ہے غزالہ!“ اس نے اسے چھیڑا۔ ”شادی کے دن تک تو نجانے کیا سے کیا بن جاؤ گی“

”مت کرو ایسی باتیں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”غصہ آتا ہے مجھے!“

”چھوڑو غصے کو بھول جاؤ پرانی باتیں۔ اعتماد اور بھروسے سے نئی زندگی کا آغاز کرو، میں نے پہلے بھی کہا تھا اگر وہ تم سے مخلص ہوتا تو بہت پہلے اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیجتا۔ اچھا یہ بتاؤ ”وہ“ کیسے ہیں؟“

”کون؟“

”تمہارے ہونے والے میاں صاحب!“

”پتا نہیں، میں نے نہیں دیکھا۔ بہنیں کہتی ہیں، مجھ سے کافی بڑے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے میرے ماں باپ پیسہ دیکھ کر مجھے کسی بڑے میاں سے بیاہ دینے کے چکر میں ہیں۔“

”مت سوچو ایسی باتیں۔“ ریشم نے اسے پیار سے سمجھایا۔ ”جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو خود بخود تمہیں اچھے لگنے لگیں گے۔ کیا نام ہے ان کا؟“

”بہروز احمد۔“ اس نے آنسو پونچھے۔

”نام تو اچھا ہے۔ وہ خود بھی اچھے ہوں گے، لگتا ہے گریس فل پر سناٹی ہو گی ان کی۔“



”مجھے کیا!“ غزالہ بڑبڑاتی تھی۔ ”اچھا، یہ لوکارڈ، اس میں مہندی کا بھی کارڈ ہے، تمہیں ضرور آنا ہے۔“  
 ”شادی میں تو ضرور آؤں گی۔ میرا وعدہ ہے۔ البتہ مہندی میں آنا مشکل ہے۔ پتا نہیں زلفی مانے گا بھی یا نہیں۔“

”تمہیں نہیں۔ تمہیں میری قسم ہے۔ دیکھو میں خاص طور پر تمہیں دعوت دینے کے لیے ای کی فٹیں کر کے گھر سے نکلی ہوں۔ ورنہ میرے باہر آنے جانے پر کب سے پابندی ہے۔ اب اگر تم نے انکار کیا تو سمجھو دوستی ختم۔“  
 ”ایسے مت کہو۔ میں نے کہاناں، شادی میں ضرور آؤں گی!“  
 ”مہندی میں بھی۔“ اس نے بچوں کی طرح اصرار کیا۔ ”میں بھائی کو بھیج کر بلوالوں کی۔“  
 ”نہیں نہیں۔“ ریشم گھبرا گئی۔ ”میں خود آ جاؤں گی۔ مریم کو ساتھ لے آؤں گی!“  
 ”وعدہ ہے نا!“

”ہاں بابا! پکا وعدہ!“ ریشم نے اسکا ہاتھ تھام کر دیا۔  
 ”اچھا میں چلتی ہوں۔ بھائی گاڑی لیے کھڑا ہے۔ پتا نہیں، کس سے مانگ کر لایا ہے۔ بڑی ضد کر کے آئی ہوں تمہارے گھر۔!“  
 ”بہت شکریہ!“ ریشم نے خلوص سے کہا۔

”اس کے جانے کے بعد وہ کچن میں چلی آئی۔ مریم روٹیاں پکانے میں مصروف تھی۔  
 ”تین دن بعد مایوں ہے غزالہ کی، پھر مہندی۔“ ریشم نے اسے مطلع کیا۔  
 ”پھر شادی، پھر ولیمہ!“ اس نے سنجیدگی سے ٹکڑا لگایا۔

”تو اور کیا؟“ وہ روٹی کا ٹکڑا توڑ کر چبانے لگی۔ ”تم چلو گی نا میرے ساتھ؟“  
 ”نا بابا! مجھے تو معاف ہی رکھو۔!“

”مجھے نہیں اچھی لگتیں یہ تمہاری غزالہ بیگم!“ وہ روٹیاں دسترخوان میں لپیٹنے لگی۔ ”کانچ میں کسی اور کا دم بھرتی تھی، اب مزے سے کسی اور سے شادی کر رہی ہیں!“

”چچ چچ۔!“ ریشم کو افسوس ہوا۔ ”بری بات ہے مریم! اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے؟“  
 ”کچھ ایسی بے چاری بھی نہیں ہے وہ!“ وہ ہاتھ دھوتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تو ہمیشہ سے اس کا کیریکٹر مشکوک ہی لگا ہے۔ تمہیں میں نے ہمیشہ اس سے دوستی رکھنے سے منع کیا۔ لیکن تم کب باز آتی ہو۔!“  
 ”تمہیں نہیں جانا تو مت جاؤ۔“ ریشم کو غصہ آ گیا۔ ”بلا وجہ باتیں کیوں بتا رہی ہو!“  
 ”ہاں بھئی۔ میں نہیں جاؤں گی، ویسے بھی میرے پاس تو کپڑے ہیں نہیں۔ تم نے تو بچو کے کان کھا کھا کر اپنے لیے لے آئیں کپڑے؟“

”ہاں تو یہ کہوناں۔ تمہیں ان کپڑوں کا غم ستا رہا ہے۔ میری بلا سے، وہ تم لے لو۔“  
 ”میں کیوں لینے لگی۔ تمہاری چیز تمہیں مبارک ہو۔!“  
 ”کیا بات ہے؟“ اماں دروازے میں نمودار ہوئی تھیں۔ ”کیا جھگڑا چل رہا ہے؟“  
 ”کچھ نہیں اماں!“ ریشم جلدی سے بولی۔ ”ہم غزالہ کی شادی کی باتیں کر رہے تھے۔“  
 ”مریم کھانا جلدی تیار کر لو۔ لڑکے باہر سے آتے ہوں گے!“ وہ مریم سے مخاطب ہوئیں۔  
 ”کھانا تو تیار ہے اماں!“ وہ آہستہ سے بولی۔  
 اماں کے جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیں۔



”یہ چند کاغذات ہیں۔ انہیں ٹائپ کر کے ان کی فائل بنادیں۔“  
 ”نیلیم کی آنکھوں میں آنکھیں اُتری۔ اس نے ایک نگاہ گھڑی پر ڈالی۔  
 ”جی ہاں۔ ٹائم اوور ہونے والا ہے۔“ عباسی صاحب اس کی آنکھیں بھانپ کر مسکرائے۔  
 ”لیکن مجبوری ہے۔ یہ پیپر آج ہی تیار کرنے ہیں۔ بے فکر رہیں۔ میں کچھ بیٹھا ہوں۔ جب تک آپ کا کام ختم نہیں ہو جاتا، میں بھی اپنا کام کرتا رہوں گا۔“  
 ”میری وین نکل جائے گی سر۔!“  
 ”میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“ وہ مسکرائے۔ کچھ اور؟“  
 وہ خاموشی سے ٹائپ رائیٹر میں کاغذ لگانے لگی۔  
 اس سے پہلے بھی وہ کئی بار اور ٹائم کر چکی تھی۔ لیکن ہمیشہ پہلے سے اماں کو بتا کر آتی تھی کہ دیر ہو جائے گی۔

”اماں یقیناً پریشان ہو جائیں گی!“ اس نے سوچا۔  
 پھر سر جھکا کر کام میں جت گئی۔  
 نجانے کتنی گھڑیاں بیت گئی تھی۔ وہ فارغ ہوئی تو سب سے پہلے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ دوسری ٹاکہ  
 عباسی صاحب پر پڑی۔

دونوں بازو دوسرے پیچھے کیے وہ بڑی محویت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ نیلیم جھینپ گئی۔  
 ”کام مکمل ہو گیا ہے سر۔!“  
 ”جی؟“ وہ چونکے۔ ”اچھا! چلیں پھر؟“  
 ”آپ جائیں سر! میں چلی جاؤں گی!“ وہ ہولے سے بولی۔  
 ”جی نہیں۔ جیسا طے ہوا تھا۔ ویسا ہی ہوگا۔ چلیں انھیں۔“  
 وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی ہمت نہ ہو سکی۔ اٹھ کر ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔  
 ”زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟“ گاڑی سڑک پر لا کر انہوں نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ ”گھر والے  
 پریشان تو نہیں ہوں گے؟“

”اماں کو پتا ہے اکثر اور ٹائم کرنا پڑتا ہے۔“ وہ بولی۔ ”پھر بھی، ہو سکتا ہے وہ پریشان ہوں۔“  
 ”جب ایک بات کا علم ہے تو پھر پریشان ہونے کا کیا مطلب!“ وہ مسکرائے۔ ”اور پھر تو کی کیا  
 دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔“

”جی!“ وہ سڑک پر نظریں جما کر بولی۔  
 اسے محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بار بار سامنے سے نظر ہٹا کر اس پر ڈالتے تھے۔ اس کی آنکھیں مرنے لگیں  
 بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ نیلیم اندر ہی اندر ڈوب ڈوب کر ابھرنے لگی۔  
 گاڑی اچانک ہی کہیں رکی تو وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ وہ ایک ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں  
 تھے۔ کچھ دیر کے لیے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”سر۔!“ تحیر کے عالم میں یہی بول پائی۔  
 وہ اپنی سیٹ سے اتر کر، گھوم کر اس کی طرف آئے۔  
 ”پلیز۔!“ وہ دروازہ کھولے کھڑے تھے۔  
 ”سر! میں۔ گھر جاؤں گی۔“



”ضرور۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ محض گھنٹہ بھر کی بات ہے!“  
 ”سراگھر والے پریشان ہوں گے!“  
 ”نیلیم پلیز! لوگ دیکھ رہے ہیں۔ آئیں شاہباش!“  
 وہ جھجکتی ہوئی گاڑی سے اتر گئی۔ چادر کے دونوں کونوں کو اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔  
 ہال میں انہوں نے نسبتاً کونے والی میز منتخب کی۔  
 ”بیٹھیں!“

”سرا! یہ اچھی بات تو نہیں ہے!“ وہ دبے دبے لہجے میں بولی۔  
 ”کچھ ایسا برا بھی نہیں۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے مسکرائے۔  
 وہ بے بسی سے سچے ہوئے پھولوں کی آرائش دیکھنے لگی۔  
 ”جانتی ہیں مس نیلیم! آج میرا جنم دن ہے۔ سالگرہ ہے میری!“ وہ مسکراتے ہوئے اسے بتا رہے تھے۔  
 ”اوہ، مبارک ہو!“ وہ یہی کہہ سکی۔  
 ”نجانے کیوں، برسوں بعد اس دن کو منانے کا جی چاہا ہے۔“ وہ کسی سوچ میں گم ہوئے۔ ”ورنہ میں تو عرصہ ہوا، خود کو بھولا بیٹھا تھا۔“

نیلیم نے ایک نگاہ ان پر ڈالی۔  
 ”نیلیم!“ اپنے خیالات سے چونک کر انہوں نے اسے دیکھا۔  
 ”جی۔!“ اس نے سرا اٹھایا۔  
 ”آپ بھی تو کچھ کہیں ناں!“  
 ”کیا کہوں سر سمجھ میں نہیں آتا!“ وہ ہولے سے مسکرائی۔  
 ”ایک بات پوچھ سکتا ہوں۔ قدرے ذاتی!“  
 ”پوچھیں!“

”آپ۔ انکیڈ ہیں؟“  
 ”نیلیم نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے اس کے خدو خال کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس کے اندر جو نیٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس سوال کے پس پردہ جو اصل سوال تھا۔ وہ بخولی اسے سمجھ گئی۔  
 ”آپ نے جواب نہیں دیا نیلیم!“ وہ اپنا اجازت بڑے اعتماد سے اس کا نام پکار رہے تھے۔  
 ”نہیں سرا!“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”مگنی ہوئی تھی میری ٹوٹ گئی۔“  
 ”اوہ! کون تھا وہ بد قسمت؟“ وہ ابرو اٹھا کر پوچھنے لگے۔  
 ”میرے کزن۔ اب وہ میرے بہنوئی ہیں۔ انہوں نے میری چھوٹی بہن کا رشتہ مانگ لیا تھا۔“  
 ”آئی سی!“ انہیں بے حد حیرت ہوئی۔ ”آپ کو چھوڑ کر؟ امیزنگ! شاید وہ دونوں آپس میں کھڑے ہوں گے!“

”یہی کہانی ہے سر۔ جانے دیں!“ وہ الجھ کر بولی۔  
 ”ایز یوش!“ وہ مسکرائے۔ ”وہی باتیں کہجیے جو کرنے کا جی چاہے۔ البتہ مجھے یہ اجازت ہرگز مت دیجیے گا۔!“  
 ”ہولے سے ہنس دیے تھے۔ نیلیم کے گال تپ گئے۔  
 ”آپ کچھ نہیں پوچھیں گی؟ میرا مطلب ہے، دو افراد مل کر بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کو جاننے کی



کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ میں نے آپ کے بارے میں پوچھا۔ یا شاید اپنی اپنی دلچسپی کی بات ہوئی ہے۔  
بھلا مجھ میں کیا دلچسپی ہوگی!"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن ویٹر آرڈر سرور کرنے آ گیا تھا۔  
کھانا دونوں نے خاموشی سے کھایا۔ نیلم نے چند لقمے زہر مار کر کے ہاتھ روک دیا۔ غور  
توقع انہوں نے اسے ٹوکا نہیں۔ خاموشی سے اپنا کھانا مکمل کیا۔  
"چلیں؟" نیکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔  
"جی!" اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
بل بے کر کے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مس نیلم!" گاڑی میں بیٹھ کر وہ بولے تھے۔ "میری اس حرکت پر اگر آپ خفائیں تو میری خدمت  
قبول کریں۔ نجانے کیوں میں اپنی اس خواہش پر بند نہ باندھ سکا۔ حالانکہ خوشیوں پر بند باندھے رہنے کی عادت  
ہے مجھے، پھر بھی نجانے کیوں! آئی ایم ساری!"  
"کوئی بات نہیں سر!" وہ سر جھکا کر یہی کہہ سکی۔  
انہوں نے گاڑی اسٹاٹ کر دی۔

واپسی کا سفر دونوں نے بڑی خاموشی سے طے کیا تھا۔  
گھر کے سامنے وہ دروازہ کھول کر اترنے لگی تو انہوں نے پکار لیا۔  
"مس نیلم!"

"جی سر؟" وہ اترتے اترتے رک گئی۔  
"میں نے آپ کو بتایا تھا۔ آج میرا جہنم دن ہے۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرت ہو لیکن حقیقت یہ ہے  
کہ اس دن میں تجھے وصول کرنے کے بجائے خود سے قریب لوگوں کو تجھے دینا پسند کرتا ہوں۔"  
نیلم ان کی بات سمجھے بغیر انہیں دیکھے جا رہی تھی۔  
"میں نے آپ کے لیے بھی کچھ لیا ہے!"  
انہوں نے جیب سے ایک چھوٹا سا ٹمبلین ڈبا نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔  
"پلیز! انکار مت کیجیے گا!"

"نہیں سر!" وہ عاجزی سے بولی۔ "ایسے تو مت کریں!"  
"میں نے کہا تھا! انکار نہ کریں!"  
انہوں نے اس کا ہاتھ تمام کر اسے ڈبا پکڑا دیا۔  
"سر۔ یہ۔!"

"اب جائیں، دیر ہو رہی ہے۔"  
وہ ایک عجیب نگاہ کے عالم میں گاڑی سے اتری۔ وہ لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر گاڑی بڑھا کر لے  
گئی۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑی بے بسی سے ان کی گاڑی کی جیتوں کو دور جاتے دیکھتی۔

سب کاموں سے فارغ ہو کر اس نے تنہائی میں اس ٹمبلین ڈبا کو کھولا۔ خوبصورت، سنہری رنگ کا تھا  
نیلم کے لبوں سے گہری سانس آزاد ہوئی۔ زنجیر اٹھا کر اس نے غور سے دیکھا۔ وہ واقعی بڑا تھا۔



اس کے کانوں میں ان کا سوال گونجا، ساتھ ہی ان کی نظریں اس کے پردہ خیال پر نمودار ہو گئیں۔  
 ان کا ہر انداز بتا رہا تھا۔ وہ اسے دل دے بیٹھے ہیں۔  
 ایک شرمیلیں مسکراہٹ نیلم کے لبوں پر نمودار ہو گئی۔ کتنے عرصے کے بعد اس نے زندگی میں کسی خوبصورت، دھڑکتے احساس کا سامنا کیا تھا۔ اسے لگا، اس کا چہرہ جھسلانے لگا تھا۔ نہانے زنجیر کا عکس تھا یا کسی خیال کا۔

مسکراتے ہوئے اس نے زنجیر واپس ڈیبا میں رکھ دی۔ اور اسے احتیاط سے اپنی دراز میں مقفل کر دیا۔  
 کتنے دن بعد وہ بستر پر اس طرح سے دراز ہوئی تھی کہ اس کا دل غموں سے آزاد تھا اور روح پر سکون  
 فضا میں تیرتی محسوس ہو رہی تھی۔ نیند بہت جلدی اس کی پلکوں پر اتر آئی تھی۔

”سروتا کہاں بھول آئے پیارے نند دیا سروتا۔ ہاں سروتا!“

وہ مکمل ڈھول پیٹ رہا تھا۔

ساری لڑکیاں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

”خدا کی پناہ! شہروز کے بچے۔ یہ کون کون سے گانے یاد ہیں تمہیں!“ مبانے اس سے ڈھول چینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت تنگ کر لیا۔ اب ہمیں گانے دو!“

”ہاں تو گائیں نا۔ میرا ساتھ دیں پیارے نند دیا!“ اس نے پھر تان لگائی۔

”یہ کیا نند دیا۔ نند دیا لگا رکھی ہے!“ صبا بھنائی۔ ”کوئی ڈھنگ کا گانا گاؤ!“

”شش!“ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ”جنا بانی نے سن لیا تو آفت پھا دے گی۔ یہ اس کا ٹورٹ

سنگ ہے۔ اسی سے تو سیکھا ہے میں نے!“

”آئی! دیکھیں نا! یہ شہروز ہمارے گانے خراب کر رہا ہے۔“ نبیلہ نے اندر داخل ہوتی عفت خانم کو

دیکھ کر موقع غنیمت جانا، جھٹ اس کی شکایت لگائی۔

”ارے واہ! ایک تو گانے وانے آتے نہیں آپ لوگوں کو۔ نہ ہی ڈھول بجانا کسی لڑکی کو آتا ہے۔

جب سے مسلسل فلمی گانے گارہی ہیں۔ کوئی تک ہے؟ شادی کے گانے گائیں۔ سروتا کہاں بھول آئے یا عترت

بابا کی اونچی حویلی، یا میں لکھ لکھ بھیجوں بتا شے میں۔“

عفت خانم کو ہنستی آ گئی۔

”شیطان کے چیلے! نکلو لڑکیوں میں سے۔ گانے دو انہیں۔“

”جی نہیں! امی حضور، یہ فاول نہیں ہونے کا، میرے بھائی کی مایوں ہے، میں بھی گانے گاؤں گا۔“

اس نے فیصلہ سنایا۔

”گاؤ مگر شرافت سے۔ حلق کیوں پھاڑنے لگتے ہو۔ عقیلہ نے اسے گھورا۔ ”کسی کی آواز ابھرنے ی

نہیں دیتے۔“

”جس میں دم غم ہو اترے میدان میں!“ وہ فخریہ بولا۔

”فیروز احمد! اندر داخل ہوا تھا۔ اسے لڑکیوں کے درمیان دلچسپ انداز دیکھ کر اس کے لبوں پر

مسکراہٹ اتری۔



”جی بھائی؟“ وہ چونکا۔ ”آجائیں۔ جگہ بناؤں، لڑکیوں اور دو دور ہو جاؤ۔“ ایک زبردست فہم تھا۔ فیروز احمد کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔  
صبا ایک لمحے کے لیے دل کے چور پر قابو پا سکی تھی۔ پھر اس نے دیکھا، نیلے بڑی حکومت سے لہجہ احمد کو تک رہی تھی۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔  
”بکومت!“ وہ خود پر قابو پا کر بولا تھا۔ ”باہر جا کر دیکھو تمہارے دوست کھڑے ہیں، جیوں سلطان فیروز“  
”واؤ۔ اب آئی دھمال چوڑی!“  
وہ اٹھ کر سب کو پھلانگتا باہر نکل گیا۔ لڑکیوں نے سکون کا سانس لیا۔  
فیروز احمد بھی سر جھکا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔  
انہوں نے دوبارہ گانے کا آغاز کیا تھا۔

”بجوا!“ وہ چھن چھن کرتی اندر آئی تھی۔ ”سچ بتائیں، کیسی لگتی ہوں؟“ نیلم نے چونک کر دیکھا پیلے جوڑے میں ملبوس، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں ڈالے وہ معصوم سی پری لگتی تھی۔  
ہاتھ کلائیوں تک چوڑیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ گولے کنارے سے سجاؤ پڑے اس پر خوب بک بکاتے۔  
”ماشاء اللہ۔“ وہ مسکرا دی۔ ”کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ آئیہ الکری پڑھ لو۔“  
”اب ایسا بھی کیا!“ وہ سچ سچ شرمائی۔  
”جلدی آ جانا ریشم! اماں پریشان ہوتی ہیں۔“ وہ اسے چھوڑنے دروازے تک آئی۔  
”زلفی کو وقت پر بھیج دیجیے گا نا۔ میں تو اسی کے ساتھ آؤں گی!“  
وہ زلفی کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔  
”اللہ حافظ بجوا!“

”اللہ حافظ!“  
”وہ کچھ دیر اسے جاتے دیکھتی رہی پھر اندر چلی گئی۔  
غزالہ کا چھوٹا سا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ریشم ادھر ادھر دیکھتی، جھپکتی کرے میں مٹس گی۔  
غزالہ اپنی بہنوں اور سہیلیوں میں گہری بیٹھی تھی۔  
”غزالہ!“ ریشم نے ہولے سے آواز دی۔  
”ریشم!“ وہ اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔ ”شکر ہے تم آئیں تو۔ میں تو مایوس ہو چکی تھی۔ تم بڑی پیاری لگ رہی ہو!“

اس نے ریشم کا گال چوما۔  
”تم بھی۔“ ریشم مسکرا دی۔  
”لڑکیوں، چلو باہر نکلو۔“ غزالہ مڑ کر لڑکیوں سے مخاطب ہوئی۔ ”میرے سر میں سخت درد ہے۔“  
دیر کے لیے کمرہ خالی کر دو۔“  
”لڑکیوں کو یہ آرڈر زیادہ پسند نہیں آیا۔ وہ منہ بتاتی بڑبڑاتی باہر نکل گئیں۔ غزالہ نے اندر سے کڑی لڑائی۔  
”یا خدا!“ پھر وہ سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ ”سر پھٹا جاتا ہے۔“  
”میں دبا دوں!“ ریشم نے پیشکش کی۔



”نہیں شکریہ!“ اس نے اٹھکوں سے کنپٹیاں دبائیں۔ ”چار گولیاں کھا چکی ہوں۔ کوئی افادہ نہیں۔“  
 ”اوہ۔ تو تم نے کہا ہوتا نا اپنی امی سے۔ وہ ڈاکٹر کو بلا لیتیں۔ میں کہوں کسی سے؟“ ریشم اس کی تکلیف دیکھ کر پریشان ہو اٹھی۔

”ریشم نے فکر مندی سے اس کی غیر ہوتی حالت کو دیکھا۔  
 ”غزالہ! کہو ناں اپنی والدہ سے!“

”ریشم! میری دوست ہونا پیاری سی۔ ایک کام کرو گی؟“ اس نے التجا کی۔  
 ”ہاں ہاں کہو۔!“

”دوپٹہ اوڑھ کر تم باہر چلی جانا۔ ریشم کو روالینا۔ کسی کو کیا پتا چلے گا۔ اپنے قد اور جسم بالکل ایک سے ہیں۔!“

”ریشم اپنی جگہ سے اُچھل ہی پڑی۔

”کیا! تم ہوش میں تو ہو؟ لوگ کیا کہیں گے؟“

”ہمارے ہاں رسم ہے، جب دلہن کو مہندی کی ریشم کرنے کے لیے لے کر جاتے ہیں۔ کوئی اس کا چہرہ نہیں دیکھتا۔ یقین کرو، کوئی گھونگھٹ نہیں اٹھائے گا۔ بلکہ بڑی سی چادر ڈال کر لے جائیں گے تمہیں!“

”ہائے میرا سر۔!“ وہ بستر پر پڑ گئی۔ ”خدا کا واسطہ ریشم۔ میں مرنے کے قریب ہو گئی ہوں، سر پٹا جاتا ہے۔ اور باہر کتنا شور شرابا ہوگا۔ تم بجھتی کیوں نہیں!“

ریشم اس کی حالت دیکھ کر متذبذب ہو گئی۔

”کسی کو علم ہوا تو میں سارا الزام تم پر رکھ دوں گی۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

”وعدہ کرتی ہوں۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا! کپڑے تو تمہارے بھی پہلے ہیں۔ یہ میرا ڈپٹہ اوڑھ لو۔ اوپر سے یہ چادر ڈالو۔ تمہارا پورا جسم چھپ جائے گا!“

اس نے پلک جھپکتے میں اسے تیار کر دیا۔

”دیکھو بال برابر فرق نہیں ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”غزالہ۔ میرا دم گھٹ جائے گا!“ وہ رو دینے کو تھی۔

”میری خاطر ریشم!“

ریشم کو یونہی شبہ سا ہوا۔ کوئی گلی کی جانب کھلتی کھڑکی میں کھڑا تھا

اس نے چادر اٹھا کر دیکھنا چاہا لیکن اسی لمحے فضا میں کچھ دھماکے سے ہوئے۔

”دولہا والے آگئے ہیں!“ غزالہ بولی۔ ”تم بستر پر بیٹھ جاؤ۔ میں ہاتھ روم میں ہوں۔ لڑکیاں آکر

تمہیں دلہن سمجھ کر لے جائیں گی!“

”غزالہ!“ اس نے بولنا چاہا لیکن وہ کنڈی گرا کر ہاتھ روم میں جا چکی تھی۔

باہر ایک شور مچا ہوا تھا۔ دولہا والے استہجاری کر رہے تھے۔ وہ نجانے کتنی دیر بے دم سی بیٹھی رہی۔

پھر دروازہ کھلا اور ہستی مسکرائی لڑکیاں اندر آ گئیں۔

”لو۔ بنو خود تیار بیٹھی ہیں!“

کسی نے اس کا بازو تھاما۔

”چلو اٹھو تمہارا رسالہ والے بڑے بے چین ہو رہے ہیں!“



وہ لرزتی۔ کانپتی ہزار اندیشوں کا شکار ان کے درمیان چلنے لگی۔ جی جی میں جتنی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس نے سب پڑھ ڈالیں۔

اسے کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ نجانے کون کون آکر اسے مہندی لگاتا گیا۔ وہ بیٹھی جی جان سے کانپ رہی تھی۔ چادر کے اندر اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

”اگر کسی نے گھونگٹ اٹھالیا۔“ رہ رہ کر اسے خیال آتا۔ ”اگر کسی نے پہچان لیا۔“

”امی حضور۔ ہم بھی مہندی لگائیں گے اپنی بھابی جان کو!“

ایک شوخ، مردانہ آواز اس کے عین سر پر گونجی تھی۔ وہ اُچھل ہی پڑی۔

”بس کرو بیٹا! بچی تھک گئی ہوگی۔“ کسی خاتون نے کہا تھا۔

”تو ہم کون سا پہاڑ کھدوا رہے ہیں ان سے۔ ذرا سی مہندی لگائیں گے اور اپنی بھابی کو دیکھیں۔“ اور بس!“

”ایک جم تھا جو اس کے اعصاب پر آکر لگا تھا۔“

”بدتمیزی نہیں شہروز۔ بھابی کو کل دیکھنا۔“ کسی نے سرزنش کی۔

”ارے کل تو انہوں نے ایسی ایسی خطرناک چیزیں لگائی ہوئی ہوں گی چہرے پر کہ اس پر ڈھونڈے دکھائی نہ دے گا۔ ہم تو آج والا چہرہ دیکھیں گے۔ سادہ دھلا دھلایا۔“

اس سے پہلے کوئی اسے منع کرتا وہ چادر اٹھا کر جھانکنے لگا تھا۔

ریشم کی وہ حالت تھی کاٹو تو لہو نہیں۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

”ماشاء اللہ۔ چشم بدور!“ وہ ہنسا تھا۔ ”نظر تو اٹھائیں بھابی! ہم آپ کے دیور خاص ہیں۔“

ریشم نے ایک باریک نگاہ اٹھائی۔ ایک بھر پور، جوان مرد اس کے چہرے پر اس قدر قریب چہرے کی

پرشوق نگاہوں سے تنک رہا تھا۔ وہ سانس لینا بھول گئی۔ دل، کسی جال میں پھنسی چڑیا کی مانند پھڑک رہا تھا۔

نے ان لرزتی پلکوں اور کانٹے ہونٹوں کو دیکھا۔ پھر اسے نجانے کیا ہوا۔ اس نے آہستگی سے چادر گرا دی۔

”دیکھ لیا بھابی کو۔!“ عفت خانم نے اسے چپت لگائی۔ ”ہو گیا شوق پورا!“

”جی۔!“ وہ نجانے کیوں ساری شوخی بھول گیا تھا۔

”چلو بھئی لڑکیوں۔ لے جاؤ بہن کو۔“ کسی نے اس کے شانے تھام کر اسے کھڑا کیا۔ لڑکیاں

کمرے کے دروازے پر ہی چھوڑ گئیں۔

”جاؤ بھئی اندر۔ ہم تو حلے دولہا والوں سے مقابلہ کرنے۔“ انہوں نے اسے اندر دھکیل دیا۔

سب کی سب ہنستی، مذاق کرتی واپس چلی گئی تھیں۔

ریشم نے اندر داخل ہو کر دروازے سے ٹیک لگالی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ ہاتھ روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ غزالہ وہاں تھی۔

”غزالہ!“ اس نے آواز دی۔ ”کہاں ہو؟“

”اچانک ہی اس کی توجہ بستر پر پڑے کاغذ نے اپنی جانب مبذول کروائی۔ اسے کسی حادثے

یکھت اور اک ہوا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر کاغذ اٹھایا۔ لکھا تھا۔

”آپ لوگوں نے زبردستی مجھ پہ یہ رشتہ تھوپا تھا۔ اب اس کی سزا بھگتیں۔ میں مگر چھوڑ کر جان

ہوں۔ کل بارات کو جو چاہیں جواب دیں۔!“



اسے حقیقتاً چکر آیا۔ بستر پر بیٹھ کر وہ خود پر قابو پانے لگی۔ پھر اس کی توجہ اپنے سر پر گئی۔ جلدی جلدی اس کا دوپٹہ اور چادر بستر پر پھینک کر اس نے اپنا ڈوپٹہ اوڑھا اور منہ چھپا کر کمرے سے نکل گئی۔

دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا تھا۔ مریم نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا۔ گہرائی ریٹم اندر داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”ریٹم۔“  
وہ جو الگنی پر کپڑے سمیٹ کر لائی تھی، پریشان ہو اٹھی۔ دونوں ہاتھوں میں سیٹے پڑے چار پائی پر ڈال کر اس کے قریب چلی آئی۔  
”کیا بات ہے؟ کس کے ساتھ آئی؟ زلفی تمہیں لینے گیا تھا، وہاں پہنچا نہیں؟“ اس نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”اماں کہاں ہیں؟ اور بھو؟“ وہاں اس کے سوالوں کے جواب میں کچھ دوسرے ہی سوال تھے۔  
”اماں نماز پڑھ رہے ہیں، بھو کھانا کھا کر لیٹی ہیں۔ کیا ہوا ہے ریٹم۔“  
”کچھ نہیں!“

اس نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا۔ پھر وہ کچن کی سمت بڑھ گئی۔  
مریم کچھ دیر کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر وہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ ریٹم بیڑی پر بیٹھی مدیوں کے پیاسے کی طرح پانی کا کٹورا منہ سے لگائے ہوئے تھی۔  
”تم نے زلفی کا انتظار بھی نہیں کیا؟ کس کے ساتھ آگئی ہو؟“ اس کی الجھن ہنوز برقرار تھی۔  
”اکیلی!“ اس نے کٹورالہیوں سے ہٹایا۔  
”اکیلی؟ اتنی دور سے؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں ”اتنی رات گئے تم اکیلی آگئیں۔ ریٹم لکی کیا آفت آپڑی تھی جو تم سے ذرا سا انتظار نہ ہو سکا۔“

”مریم۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھ کر راز داری سے کہا۔ ”ایک بات بتاؤں بہت خطرناک۔“  
”بہت خطرناک۔..... ہاں کہو!“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔  
”غزالہ..... غزالہ.....“ الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔ ”غزالہ گھر سے بھاگ گئی۔“  
مریم بری طرح اچھلی تھی۔

”کیا.....؟ بھاگ گئی؟ مگر کیوں کس کے ساتھ؟“  
”شی آہستہ بولو۔“ ریٹم نے اس کا ہاتھ دبایا ”بھو یا اماں نے سن لیا تو میری خیر نہ ہوگی، اماں کہیں گی، بری دوستی نبھانے کیسی لڑکیوں سے ہے۔“

”وہ۔“ الفاظ پھر اس کے گلے میں اٹکنے لگے ”مریم! دراصل اس نے مجھے.....“  
”کیا تمہیں؟“ مریم نے اسے گھورا۔

”دیکھو..... تم مجھے ڈانٹو گی، بھو کو بتا دو گی۔“ وہ خوفزدہ ہوئی۔  
”بکومت۔ جلدی جلدی کہو، کیا تیر مار کر آئی ہو، تمہاری بے وقوفیوں سے تو میں پہلے ہی مایوس آئی ہوں۔“ مریم کو یقین ہو گیا کہ وہ کچھ ایسا دیا کر آئی ہے۔  
ریٹم نے ڈرتے جھپکتے اسے ساری رام کہانی سنا ڈالی۔



”میرے خدا!“ مریم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ”ریشم! تمہیں کیا سرسام ہو گیا تھا؟ حال  
حوالہ کھو بیٹھی تھیں اپنے، اتنا بڑا ڈرامہ اتنے آرام سے کھیل کر چلی آئیں اگر تمہارا پول وہاں کھل جاتا تو کتنی  
پہچان لیتا تو کیا عزت رہ جاتی تمہاری؟ لوگ کیا کہتے؟ غزالہ کے ماں باپ، بہن بھائیوں کے سامنے تم کیا غائب  
دیتیں، کتنے لوگوں میں تماشا بن کر رہ جاتیں تم، وہ دیوانی لڑکی تو جو قدم اٹھا چکی سو اٹھا چکی، تم اہم کس آدمی کی  
پاداش میں وہ بے عزتی جھیلیں؟“

”مجھے کیا علم تھا مریم! وہ کیا کھیل کھیلنے جارہی ہے جس وقت وہ گڑگڑا کر مجھے کہیں کہ اسے ہانڈ کر  
رہی تھی۔ میرے فرشتوں کو خبر نہیں تھی کہ وہ سب ایک دھوکا ہے میں تو اس کی بگڑتی حالت کے پیش نظر یہ سوچ کر  
راضی ہو گئی کہ اگر بعد میں کچھ ہوا بھی تو میں سارا الزام اس کے سر رکھ کر بری الذمہ ہو جاؤں گی اور چنگی اس کی  
طبیعت اس قدر خراب ہے تو کوئی کچھ کہے گا بھی نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے مریم کہ شاید میں نے کچھ بھی نہیں سنا  
اس نے مجھے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔“

”اور اب سوچو کہ تم کتنی نادان ہو اور کتنی آسانی سے بے وقوف بنائی جاسکتی ہو، میں تمہیں ہانڈ کر  
لڑکی سے دور رہنے کا مشورہ دیتی رہی اور تم نے کبھی میری باتوں کا قابل اعتبار نہ جانا۔“ مریم ہراسی سے بولی  
اور تم یہ مت سمجھو کہ تم صاف سچ کر نکل آئی وہاں سب کو علم ہو گا کہ غزالہ نے تم سے کوئی خاص بات کہنے کے لیے  
کمرہ خالی کروایا تھا اور تم اس کی واحد دوست تھیں جو اس کے فرار کے وقت اس کے پاس موجود تھیں۔ اس کے  
ماں باپ ضرور یہاں آئیں گے یہ جاننے کے لیے کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ گئی ہے۔“  
”مجھے کیا معلوم۔“ وہ سخت خوفزدہ ہو گئی۔ ”وہ میرے پاس کیا لینے آئیں گے۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں  
کہ وہ لڑکا کہاں رہتا ہے۔“

”کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم جانتی ہو  
اور یہ کہ تم نے غزالہ کے فرار میں اس کی پوری مدد کی ہے اور تم سمجھتی ہو اماں اور بچو کو کچھ پتا نہیں پڑے گا۔  
ساری بات بتائی جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم خود پہلے انہیں اعتماد میں لے لو۔“  
”مریم۔“ وہ رونے لگی ”میں کیا کروں، میں کیوں بیٹھے بیٹھائے اس مصیبت میں پھنس گئی۔“  
”تمہاری اپنی نادانیاں ہیں بھگتو۔“

دروازہ بجتے کی آواز پر دونوں چونک اٹھی تھیں۔  
”میں کھولتی ہوں۔“ ریشم جلدی سے اٹھنے لگی۔  
”رہنے دو۔“ مریم نے اس کا ہاتھ تھاما ”ناصر دیکھ لے گا، اب تم بیوی ہو گئی ہو۔ میں نہ ہوں۔“  
دروازے پر مت پہنچ جایا کرو۔“

چند لمحوں بعد زلفی ان کے سر پر تھا۔  
”کس کے ساتھ آئی ہو۔“ وہ اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔  
”مم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ وہ ہکلا کر رہ گئی۔  
”غزالہ کا بھائی چھوڑ گیا تھا۔“ مریم جلدی سے بولی۔ ”وہ اپنے کچھ رشتے داروں کو گھنٹے لے  
طرف آیا تھا۔ دیر ہو جانے کے خیال سے یہ بھی چلی آئی۔“  
”مجھے خوار کیوں کروایا۔“

وہ بڑبڑاتا ہوا چل دیا۔  
”مریم۔“ ریشم نے ڈرتے ڈرتے اسے دیکھا۔ ”زلفی وہاں سے ہو کر آیا ہے اتنے لمبے عرصے کے لیے“



اسے بالکل خبر نہیں ہوئی۔“

”اب کیا وہ لوگ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کروادیں گے کہ ہر ایسے غیر مسلم کو قتل ہو جائے۔“ وہ جھلجھلاہٹے ہوئے اس تلخ حقیقت کو خود بھی قبول نہیں کر پائے ہوں گے، اپنے طور پر کوشش کر رہے ہوں گے اسے ڈھونڈ کر واپس لانے کی۔“

”اللہ کرے وہ مل جائے۔ ہے تا مریم۔“

”ہاں خدا کرے۔“ وہ بڑبڑاتی ”نادان لڑکی، اس درجہ نادانی۔“

”مریم۔“ رشیم اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم بھی تو میری ہم عمری ہو پھر تمہیں یہ عقل مندی

کی باتیں کیسے آ جاتی ہیں؟“

مریم نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔



”اوہ تھینکس گاڈ۔“ ایک گہری سانس اس کے سینے سے آزاد ہوا تھا۔

کتنے اعصاب شکن لمحات ہوتے تھے جب وہ دوسری جانب جاتی ہوئی ٹیل کی آواز سنا کرتی تھی۔ آج کئی دنوں کے بعد وہاں کا ریسور اٹھایا گیا تھا۔

”الماس! کیسی ہو۔“ رضا اس کی آواز پہچان کر پوچھ رہا تھا۔

”اس کے لہجے میں وہ ساری بے قراریاں تھیں جنہیں محسوس کرنے کی وہ متنی تھی، اسے لگاں کے دل و دماغ کا آدھا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔

”رضا! رضاتم۔“ کچھ دیر کے لیے اس سے کچھ بھی نہ بولا گیا۔

”بولو جانم۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”کتنے دن ہو گئے ہیں اس مدھر آواز کو سننے ہوئے ہمارے الی! جب سب لوگ میری آواز کی تعریف کرتے ہیں میرے گلے کی مناس کو سراہتے ہیں تو میں سوچتا ہوں اگر یہ لوگ تمہاری آواز سن لیں تو شاید دیوانے ہی ہو جائیں میری طرح۔“ وہ ہنسا۔

کانوں کے رستے دل میں اترتی ہوئی آواز

دیوانہ اور مدہوش سا کرتی ہوئی آواز

”لفظوں کے ہی تو جادو گر ہو تم۔“ وہ قدرے خفگی سے بولی تھی ”جب جے چاہو اپنے الفاظ کے

پھیرے میں لا کر بے بس کر ڈالتے ہو۔“

”ارے رے۔۔۔۔۔ یہ کیسی باتیں کر رہی ہو جانم۔“ وہ ہنسا ”ایسے گلے شکوے تم جیسا شاید لڑکی کو سوٹ نہیں کرتے۔ کوئی اچھی سی بات کرو پیاری سی۔ ہمیں علم تو ہو کہ ہم اتنے دن بعد اپنے وطن کو لوٹے ہیں اور اپنی مشکوہ سے بات کر رہے ہیں۔“

”جس کا پچھلے کئی دنوں سے تمہیں شاید کوئی خیال ہی نہیں تھا جسے تم بھولے بیٹھے تھے۔“ وہ تیزی سے

بولی ”تمہیں کچھ علم ہے رضا کتنے ٹینس کر دینے والے دن تھے یہ، مجھے لگتا تھا مجھے کچھ ہو جائے گا یا تو میں پاگل ہو

جاؤں گی یا خودکشی کر لوں گی۔“

”ہوں ہوں۔ پاگل ہوں آپ کے دشمن۔ ارے الماس بی بی! آپ تو وہ ہیں جس کی خاطر دوسرے

لوگ پاگل ہوتے ہیں یا خودکشی کر بیٹھتے ہیں۔ آپ پر بھلا یہ وقت کیوں آئے۔“

”رضا۔۔۔۔۔! بی سیریس پلیز۔“

”ارے۔۔۔۔۔“



”دیکھو، ایسا کرو شام کو یہاں گھر آ جاؤ۔ دلاور چچا تم سے ملنا چاہتے ہیں نہ صرف وہ بلکہ تمہارے سارے افراد نہایت بے چین ہیں۔ ہر کوئی تمہیں جاننے کا، تم سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ مجھ پر کتنا پشیمانی ہے۔“

”دیکھو الماس! میں تمہاری پرابلیمز کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا ”اور اسی لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ ہمیں اپنے اس نئے تعلق کو کاغذ پر نقل رکھنا ہے لیکن تمہاری جلد بازی نے سارا کام بگاڑ دیا۔“

”میری جلد بازی؟ تمہیں پتا تو ہے رضا! ہر کوئی مجھے پریشاں کر رہا تھا عثمان سے شادی کرنے کے لیے۔ آخر میں کب تک انہیں بہانوں سے مطمئن کر سکتی تھی؟ آخر کار مجھے اپنے انکار کی ٹھوس وجہ بتانی ہی تھی، وہاں ویسے شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں نے واقعی جلد بازی سے کام لیا ہے۔“

اس کے انداز میں برہمی در آئی تھی۔

”الماس! ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈی جانو! میری مجبوریوں کو سمجھو آخر میں کس میں تمہارے چچا سے بات کرنے آؤں۔ میرے پاس کچھ تو ہوا اچھا یہ بتاؤ، تمہارے والد کن دنوں میں یہاں ہوتے ہیں؟“

”کیا مطلب؟ اس بات سے تمہارے آنے کا کیا تعلق؟“

میرے خیال میں زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ میں تمہارے والد سے بات کروں تمہارے چچا کی نسبت زیادہ سوٹ ایبل شخص ہیں یہ باتیں کرنے کے لیے۔“

الماس نے ایک گہرا سانس لیا۔

”میرے والد کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے رضا! میرے چچا ہی ہماری فیملی کو لگ آفر کرتے ہیں۔ تمہیں ان سے ملنا ہے۔“

”واٹ؟“ اسے جھٹکا لگا تھا یہ سن کر ”تمہارے والد آئی مین..... کیا تمہارے والدین میں طلاق ہو چکی ہے۔“

”اوہ نو..... تم نے..... تم نے مجھے پہلے کبھی یہ بات کیوں نہیں بتائی الماس۔“

”کیا فرق پڑتا ہے تکلیف دہ باتیں نہ کہی جائیں تو زیادہ بہتر رہتا ہے خیر تم اس ٹاپک کو جانے۔“

پھر آ رہے ہونا؟ چچا تم سے جلد از جلد ملنا چاہتے ہیں۔“

”دیکھو المی! میں کل رات ہی لوٹا ہوں۔ ابھی مجھے ڈھیروں کام نمٹانے ہیں۔ تمہارے چچا سے ملنا ذرا جتنی طور پر پرسکون ہو کر ملنا چاہتا ہوں، تم کیوں نہیں چلی آتیں شام کو۔“

”میں؟ میں اب شاید نہ آسکوں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”وائے ناٹ۔ تم خود مختار ہو۔ کسی کی پابند تو نہیں۔ آ جاؤ نا المی کتنے دن ہو گئے ہیں نہیں دیکھے ہوئے۔ تم سے ملے ہوئے۔ آ جاؤ نا پلیز۔“

اس کی آواز میں وہی خمار اترنے لگا جو الماس کے ہوش و حواس کو خوابیدہ کر دیا کرتا تھا۔

”اوکے، آئی ول ٹرائی۔“

”میں انتظار کروں گا۔“

”ادفو! ارے بھئی کوئی میری نظر اتار دے۔ میں تو پورا شہزادہ لگ رہا ہوں۔“ اس نے راسکے کرتے اور شلوار میں ملبوس اپنے سراپے کو آکھینے میں غور سے دیکھا۔ ”ارے جننا بانی! لال مرچ لے آؤ میں پابندی کرتے اور شلوار میں ملبوس اپنے سراپے کو آکھینے میں غور سے دیکھا۔“



”ہمیں کرنے کے اور بھی بہت کام ہیں۔“ گہرے جانی رنگ کا رنگی لباس زیب تن کئے جناباکی نے قدرے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا ”دلہن کو لے آؤ۔ رات کو اتار دیں گے نظر۔“

”ہاں تب تک ہم مرجھا کر ہی رہ جائیں گے“ وہ بگڑا نہیں کیا پتا، کل کی تقریب میں لڑکیاں ہمیں کس کس طرح سے گھور رہی تھیں۔“

”شہروز.....! بھئی وہ چھوہارے کہاں ہیں۔“ عفت خانم گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں۔ ”پورا ڈکرا خدا جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔“

”یہ بھی ہمارا کمال ہے“ وہ فخریہ مسکرایا ”وہ ڈکرا ہم گاڑی میں رکھ چکے ہیں۔“

”یا خدا.....“ وہ جھنجھلا گئیں ”کام سرانجام دے کر اطلاع تو کر دیا کرو۔ دیکھو میں گھنٹہ بھر سے خوار ہو رہی ہوں اور تم یہاں گھسے کیا کر رہے ہو۔ نیچے سہرا بندی ہونے والی ہے۔“

”ہائیں بھائی جان کے بجائے ہماری سہرا بندی؟ یہ کیا ماجرا ہے۔ ہم نے پہلے ہی کہا تھا۔ ای حضور! ہمیں دلہن والوں سے چھپا کر رکھیں خیر ہمیں چنداں اعتراض نہیں آپ چلیے ہم آتے ہیں۔“

”باجی کب کے چلے گئے۔“ جمنائسی تھی۔

”اوہو..... ہو.....“ وہ گھبرا کر دروازے کی سمت بڑھاتا تھا۔

نیچے ایک ادھم مچا ہوا تھا، ہر کوئی اپنی اپنی تیاری میں مصروف تھا۔ بارات روانہ ہونے میں تھوڑی سی دیر رہ گئی تھی۔

”دیکھو تو نبیلہ..... یہ عقیلہ کہاں رہ گئی۔ میرے کپڑے پر لیس کرنے کے لیے لے گئی تھی۔“ نبیلہ کی والدہ اس سے مخاطب تھیں۔

”وہ اوپر گئی تھی۔“ نبیلہ اپنا آئی لائنر ٹھیک سے جمانے میں مصروف تھی۔ ”میں دیکھتی ہوں۔“ وہ اپنا میک اپ کا سامان واپس بیگ میں رکھنے لگی۔

”اسی وقت صبا اور نجمہ لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں۔ سیاہ چمکدار نیٹ کے لباس میں کملی کملی مبا کی جانب کئی طرف سے نظریں اٹھی تھیں۔“

”السلام علیکم۔“ وہ نبیلہ سے مخاطب تھی۔

”اوہ..... والسلام۔“ اس نے سراہتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ ”بہت پیاری لگ رہی ہو، بھئی منگنی کے تو بڑے مثبت اثرات نظر آرہے ہیں۔ بہت نکھر گئی ہو تم صبا!“

”جھینک یو!“ وہ شکفتگی سے ہنس دی۔

قدرے فاصلے پر کھڑے فیروز احمد نے ایک گہری نگاہ اس کی جانب کی تھی۔ وہ نجانے کس کام سے اندر آیا تھا اور اپنی جگہ پر جیسے قہم سا گیا تھا نبیلہ کی بات اس نے بڑے غور سے سنی تھی۔ صبا کو وہ نظر بہت اچھی پرائی سی لگی تھی۔ جیسے وہ کسی اور کی نظر ہو۔ فیروز احمد نے تو اسے آج تک اس طرح سے نہ دیکھا تھا کہ وہ خود میں سمٹ کر رہ جائے، نجانے وہ پتھر کب اور کیسے موم ہوا تھا۔

”بھائی جان۔“ شہروز نے اسے چونکا دیا ”بھائی جان کہاں ہیں۔“

”بھائی جان۔“ شہروز نے اسے چونکا دیا ”بھائی جان کہاں ہیں۔“

”پتا نہیں۔ وہ تیار ہونے اپنے کمرے میں گئے تھے۔“ فیروز نے غور سے بھائی کا چہرہ دیکھا ”کیوں کیا بات ہے۔“

”آپ ڈرائنگ روم میں چلیے۔“ وہ قدرے عجلت میں کہتا ہوا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا تھا، وہ تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔



2

۱۰۔ اچے کاروں سے برا کاروں کے ساتھ ملا کر رہنا۔

یہاں پر ایک شخص نے کہا کہ میں نے یہ سب سنا ہے۔

[illegible]

”انہوں نے فیروز احمد کی جانب سے تحریر کی کچھ باتوں کو درست کیا۔“  
 ”جیسے۔“  
 ”ہاں تو دیکھا یہ سوں بعد ان کے خاندان کو کوئی خوش نصیب ہوئے  
 فیروز احمد نے عجیب سی نگہروں سے ان لوگوں کا سکون درمدم کر دیا تھا۔ ایک بار پھر اس کے دل میں  
 جہنمی اور یہ سوں بعد اس جیسا تھا۔ اس کا یہی چاہہ ہوا تھا وہ دنیا کی ساری نعمتوں کو ایک لمحے  
 کے لئے ختم سے ختم کر دیتا تھا۔“

اٹھا کر کے گولیاں دے۔ یہ سن کر جھوٹا حق کہہ کر ان کو گھپ اندر میرے میں روٹنی کی ایک کرن چھوٹی تھی۔ ”میلنا زینب کی ماں سے مفت خاں کو گھپ اندر میرے میں روٹنی کی ایک کرن چھوٹی تھی۔“

”بہن کرنا۔“ ”خدا کے لیے اے امی! کسی کو اتنا تو بے وقت مت کیجیے۔“ انہوں نے جھٹکا مارا۔

دہنیں بیٹا میرا محمدی و بے وقت نہ ہر برس ہے بلکہ اس وقت اگر وہ کسی مدد کر دے  
 کہ تمام احرام ٹھہریں گے، ہم تو ساری زندگی ان کے آگے سر جھکا رہے ہیں۔<sup>۱۱</sup>  
 لے کر مائیت قاطعی

وہاں پہنچیں۔ وہ ہر اس جگہ پر اٹھ کر بڑے اکیس بار دعا پڑھ کر پھر اسی شخص کے قتل کی جگہ لاکر

نظامِ جاہلی پر۔ خوشامدیں کہیں آئیں گی الی جان اس بات کا اب یقین کر لی کہ تو بہتر ہے۔  
 خیر! اسے الی درست کہہ رہی تھی، پہلی حالت۔ ”خیر دے دے الی علیہ السلام“<sup>۲۰</sup>

میں نے یہ سب کچھ کہہ کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ ان کے دل میں یہ بات گونجنے لگی کہ یہ سب کچھ تو میری ہی بات ہے۔

کمال باغ میں۔  
"میں مجبور نہ کریں پلیز۔" وہ کہہ کر اسے گلے لگے۔

● ● ●  
کھانے کی آواز براس نے چھٹک کر سرائی الٹا۔  
● ● ●

تھے تھے اعزاز میں ہر صنف اندرونِ اہل ہوئے تھے۔  
اک "۵" ضمیمہ ذکرِ نظر

کے لئے یہاں رہا کرتا تھا۔ یہاں سے وہ بھی "خیر القریٰ" کے لئے آئے۔

”لوگوں کہاں تھی جہاں؟“ وہ آکر کرسی پر بیٹھ گئے۔  
”جی، کمزور فکری جہاں“ اس نے دلہن کو منہ کیجئے میں سے کہا۔

”تم بھی چلی جاؤ۔ اکیس گھر میں رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر سارنہ کی کھڑکی سے اس نے کہا۔“

10

اک دیا جائے رمضان  
اندر صفت

اندر صفت خاتم کے ساتھ خزانہ کے والدین موجود تھے۔

خیر ذرا احمد نے حال کا سنا ہوا چہرہ دیکھا۔ اس نے کہا بات ہے امی جان؟ خیریت ہے ماں؟

”بیٹے! ہر روز کہاں ہے۔“ انہوں نے مری مری آواز میں پوچھا۔  
آتے ہیں۔ ٹھہر رہا ہوں کہیں۔“ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

خرجت قريبا الى

سلام علیکم۔ انہوں نے غزالہ کے والد سے مصافحہ کیا۔

رحمت کرنی پڑی۔

ہم۔ غزالہ کے بارش والد کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔

تھ جوڑ کر محضت کرنے آئے ہیں ہمیں محاف کردیں۔

ت ہے، پھر تو ان ہی بزرگوار  
 ان کی چلی گئی ہے۔

ان کے اعصاب پر جو گرا تھا، دیکھا مطلب؟ کہاں؟

میں یہ سزا دی اس کی کرتی۔

میں نے ایک نئے عالم میں اپنے ان دونوں کو روکا ہوا دیکھ رہے تھے

ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہاں پر فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مال سے دوسروں کو کھانا کھانے کے لئے دے دے تو اس کا اجر بڑھ جائے گا۔

$\frac{d}{dt} \left( \frac{\partial L}{\partial \dot{x}} \right) = \frac{\partial L}{\partial x}$

”جیسے بہتری کی بات ہے۔ ہمارے جیسے ڈوب سرنے کا مقام جہنم کی طرف ہے۔“

بِکُتْلَا مَوْتًا بِأَكْر

میں کھڑا ہو گیا۔

نہ دے گا۔ میں نہ بیچے۔ سب عام لے اس کا ہاتھ پکڑا، بیچہ جاوے۔  
 کیا کہیں کے لوگوں سے ہے۔“ وہ دلی دلی آواز میں چیخا

”بہروز احمد نے چلیس مہینوں کے سامنے

- الخیر ہے جیسا کہ

چادر کے چلو سے آنسو لوٹتے "خدا کسی دُشمن کو ایسا بھلا نہ کرے کہ اس سے مرے ہوئے۔ ہر جہت جہدِ دلچھڑائی جگائے وہ کہاں اور اس کے ساتھ علی

عزیزانِ ادھر!۔۔۔۔۔ ارے! کیا زخمِ لاکھی ہے۔۔۔

میرا لڑکی۔ "صفت خاتمِ مال کا دکھ محسوس کر کے تڑپ اٹھیں۔" بہت بڑا سامان ہے



325  
 "وہ کہہ کر وہ بھی" بھائی کی ہنسی سے چمک اٹھا۔  
 "اے بھائی!"

"اس کا ہاں ہے۔" "اس کا ہاں ہے۔"  
 "س نے اس کا ہاں ہے۔"  
 "س نے اس کا ہاں ہے۔"

”ہاں ایسا ہی ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”مگر یہ تو تمہاری کوئی گمان تک نہ تھا کہ وہ لوگ کیا کرنے جاویں گے۔ وہ بہت ہی ہوشیار لوگ ہیں۔“

خدا کی تعریف میں کھینچتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر چلیں پہن لی۔ دوپہ سر پر تھا کہ وہ بازار سے پرانی تھی  
وہ آج، عمارت۔ اس نے ذرا سا باہر جھانکا "فرما بیٹے۔"

”جیسے چشم سے کام ہے۔ اسی کی توجہ میں۔“ باہر کھڑے لڑکے کا انداز کمر کھٹکا۔  
”چشم نہیں ہے، علی اس کی بیٹی، لیکن اہول، جو کہتا ہے مجھے کہہ۔“

”ہم سب جہاں جہاں تھی ہے جہاں اب کوئی عزت نہیں رہی، آپ کی انہی عزت ہے۔ ہر ایک دیکھیں باہر جہاں جہاں تھی ہے جہاں اب کوئی عزت نہیں رہی۔“

۱۰۷۔ "میں مطلب ہے آپ کا؟" کسی بانیس کر رہے ہیں، دیکھتے آپ کی ہین سے ریشم کی صرف ہر ہر کی

جہاں جوتی ہے اور برائے میرانی ان دھمکیوں سے گریز کیجئے۔ یہ شرطیں کام کر کے ملتی ہیں۔

[illegible]

بیابان کا علم ہے تب ہی وہ کسی کو دیتے، تجھ پر ہی آئی گی۔  
 ”کچھ نہیں ہے۔ میں عرض کر چکی ہوں۔“ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

ابن ابی اوس کی روایت سے اس کی کوٹش نام کام بنا دی۔

”دیکھو بی بی! ہم سے سب بے درجہ چمک رہے ہیں۔ میں رات یہ جانتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہی آئے۔ ہم نے پولیس کیس ہے۔ ہم نے رپورٹ میں لکھا ہی کہ ان کا نام ہے لیڈا تو

”مہاراج! لیے پڑی مشکل ہو جائے گی۔“  
 تھارے ”ننگلمہ..... کون سے ماہر۔“

اندر سے اماں باہر کی طرف آ رہی تھیں۔ اس لڑکے نے اپنا پاؤں پیچھے کیا اور پلٹ کر ذرا

گورانا تک پہنچا۔ دوسرے بھی تھے ہیں سرزداری سحر اڑی کی۔۔۔ اے دروازہ بند کر لی۔  
 ”گو مان تھا خلیفہ!“ اماں محسن تک آن پئی تھیں۔

”کوئی نہیں اہاں۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی ”یونہی کسی کا کھڑو چھو رہا تھا۔“

ده زار و قطار دوری می‌حی -

”یہاں ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اہم یہ کہ بری طرح سے چڑی ہوئی ہو۔“

رسائل میں زمرہ ہوں اور مجھے جانتا ہے کہ

324  
 ال دیا جائے۔  
 کر یہاں آکر ایسے لذت جانی ہو جسے تم کو اپنی کے لئے دس چکر دیا جو مردوں۔ کوئی کسی آئے جو اس کے لئے  
 بخشنے چلائے ہوئے جو آئے انار ہے۔

”کون سے خزانے دفن ہیں یہاں؟“ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی سرکاری خزانے ہیں۔“

”خود کو بے قدر مت رو بہیم۔ ہم۔“ وہ عجیب انداز میں سہکرائے۔ ”تم لوگ اترنا ہو۔ خود کو کم ہونا سیکھا۔“

ہے لے جو ہے، وہ ان اوقات میں پائیں صرف بدل کرنے کی ضرورت ہے اور کبھی اپنی تباہیوں کے یہ عذاب رت جھکوں کی داستانیں جا کر بھی اپنی گنہگاروں کو نہ پہنچا رہے۔

سے ہم بڑی ساجے اور دم ..... وہ دلا سارے پر اے بڑے۔  
 "آزاد ہو جاؤ۔"  
 "کھاؤ۔"

جملہ میں رہے وہ باہدورم میں کس رہے۔  
شہنم کے تن پران میں انگارے ملک اٹھے۔ کس نس میں لہو زہر بن کر دوڑ کر اٹھے۔

”یہ اے دنیا! تم کھڑا کرنا اس فتنہ کے لیے، وہاں ہوں دیا کرتا تھا۔“

ساحب: یہ تجاویز یا یہ رست چلے، اس لیے ہر اقدار کیے گئے ہیں، اس لیے میں اس منجر سے میں متوجہ ہوں۔

میں محفل کو شکر کرنے کے واسطے لگا رکھا ہے، جس کی مطلب یہ میرے دو دو گنا، کیا ہے اور یہ

میں ہوئی دھواں سے بیگانہ ہو جاؤں۔ اپنے آپ سمیت ہر شے کو فراموش کر ڈالوں۔ یہ بھی نہیں ہے

رات سکتے ہی رہو گے۔ رشتوں کے درد کو کھٹے نہیں ہوتاں سمجھنے لگو گے۔“

مرغیے میں کھاروہ تیز تیز سا میں لے رہی تھی۔

”میرا نے ڈرتے ڈرتے اسے مخاطب کیا تھا۔“

”وہ بڑھاپے چھ سے تین ہفت کی۔“  
”ہر بار کوئی کھڑا ہے۔“

..... ۵۹- اس نے سر اٹھایا۔  
 ۶۰- چشم کی دوست کی تاغزالہ۔ اس نے قصہ لگایا ”اس سر آکھ“۔

۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴-۱۵-۱۶-۱۷-۱۸-۱۹-۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵-۶۶-۶۷-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰

دیر میرا ہی سے مراد ہی دوست رہی۔ اس کی سمجھ میں تو یہی طور کچھ بھی نہ آ سکا۔  
 ”طبیب؟ کون غزالہ اور اس کا بھائی ریٹیم کو کیوں ملا رہا ہے۔“

”وہ غزالہ، جس کی شادی ہو چکی۔“

اس کی حیرانی دو چند ہوئی۔  
 ”اے ماں باپ! چرہ زنیں۔“  
 ”اگر سے بھاک گئی تھی۔“



327

حضرت غانم نے سہری سانس لی۔ "مکتے انتظار کے بعد یہ دن آئے تھے۔ کیا اسرار تھا  
"بہر حال۔" "جیسے کا دور وہ دن آیا بھی اور یوں ہی گزر گیا، مگر دن میں کوئی خوشی والے۔"  
"بہر حال۔" "نہ روز احمد نے ہاں کا ہاتھ تھا۔" "بس، زیادہ مست سوچے بھی نہیں کیا کہ حاتم کرم سے کہہ کر  
"بہر حال۔" "خیر و عافیت پہلی چھت کے نیچے ہیں۔ لوگوں پر تو غیب سے کس کس طرح سے، عار سے، ناز  
"بہر حال۔" "کے ساتھ جہاد ہو رہا ہے جس جوان حادقوں کو سہا جاتے ہیں، وہ بھی تو انسان ہی ہوں گے، جس کا تو  
"بہر حال۔" "دنوں کے چند دنوں میں ہم سب ایک ڈراما خوب کچھ ہی معمول چاہیں گے۔ بھائی کی منگنی انشاء  
"بہر حال۔" "ہو جائے گی۔"

”ایک دفعہ ایک شخص نے اپنے کو تشکر بھری لہروں سے دیکھا۔  
 غفلت غلام نے بیٹا ہو بیٹا: خدائے تمام بھائیوں کو ملے عمر دے۔ محبت ملائی دے، خوشیاں دے۔ یہ مجھ کو ملے  
 ”ایک دفعہ تم آتے ہی رہتے ہیں۔“

میں نے تو زندگی میں  
 "چلیں ہمراہ اپنے گھر سے جاگ کر" وہاں کو پہنچا

کمرے میں اس کا شہزادہ نے پہرا تاس غر صوفی کی پشت سے پکھ لای۔  
 شہزادہ معمولی بات بھی نہیں ہے بھائی! جسے اس قدر جلد فزائش کر دیا جائے۔ ”وہ سوچ رہا  
 ”اپنی معمولی بات میں کیا کھمکھاؤ لگا ہے۔ میں جانتا ہوں اب حرمے تک وہ پھر نہ سکرانے کی ہمت نہ کر  
 کے بھائی کے بیٹے میں کیا کھمکھاؤ لگا ہے۔“

”وہ بولیں..... وہ تو اس کی بجائے مل جائے تو گھاس گھوت دوں اس کا۔ اپنی عزت داد پر کھانی تھی تو ہماری کیلئے یہ کیا ضرورت تھی، ہمارے دلوں کو درد نہ کرنے کی اجازت اسے کہنے دی، کیا بگاڑا رشتہ  
 بن گیا ہے؟“  
 ”معموماً یہی ہے اس کا۔“  
 ”اس کے پردہ تصور پر دو درز قچیلیں اور کانپتے ہوئے نمودار ہو گئے اس نے تخی سے آنکھیں میچ لی ہیں۔“

”اندر آ رہی ہوں۔“  
 ”ذو اسمِ اعظم کیے لبوں پر بڑی خوبصورت مسکراہٹ سجائے پوچھ رہی تھی  
 ”آئندہ کو بے تحاشہ حیرت ہوئی تھی۔“ ”آؤ، آؤ.....! خدا! اس حیرت سے رہی نہ  
 ”ارے بہن!.....“

”اے تمہیں عمر دراز عطا فرمائے۔“ وہ بہت سی ہوئی اندر چلی آئی۔

آمنہ نے اس کی تیاری کا نہایت حیرت سے جائزہ لیا، ڈارک پہلے پتھر ساڑھی میں دو نہایت ڈانڈرت لگے، یہی تھی۔ چست، مختصر سے بالٹرز سے اس کے جسم کی ساری لکڑی جھلک رہی تھی۔ ہونٹوں پر آنکھیں ہانک جگے آنکھوں میں کاہل بھر دی وہ قتل کر ڈالنے کی حد تک حسین نظر آ رہی تھی۔

”شہر..... تم ہی ہو گا۔“ آمنہ نے اسے بازووں سے گھرا۔

”کس مطلب ہے تمہارا۔“ وہ کہی۔

”شکر ہے خدا کا۔ تمہارا یہ مطمئن اور  
کراہتم لاء، کچھ حق بتاؤ بھائی سے دوستی ہو گئی۔“

وہ رازداری سے پوچھنے لگی۔ وہ سر جھٹک کر مسکرا دی۔

326

”سم لے لیں جو.....“ اس نے آنسو پونچھے ”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ کچھ بچ میں لایا ہے جس پر سزا تھی۔ وہ لڑکا کون تھا۔ کہاں رہتا تھا، میں نہیں جانتی، غزالہ مجھے کسی بات بتاتی تھی تو میں وہی کہتی تھی، پھر اس نے بتایا۔ اس کے والدین نے اس کی شادی کہیں اور طے کر دی ہے۔ بس یہ سارا قصہ“

دلی رات.....“

اس نے ایک نغمہ مرثیہ پر ڈالی، مرثیہ نے جو لے سے نفی میں سر ملایا۔ - دھم اس کا مطلب یہ ہو گیا۔  
”بہندی والی رات جب میں گاتے گاتے تھک گئی..... تو غزالہ کے پاس اس کے کمر پر بیٹھ کر.....“

”میں جلدی میں کی گئی۔“  
 ”اے میری بیٹی،“

پچھلے کئی غیر دلائل آگئی۔“

”وہ قہقاری مدد سے نکلائی ہے۔“  
”نہیں! بچہ..... قسم سے ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”یا خدا.....!“ عظیم نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا ”میں کیا کروں، یہ حالات تو کسی بھی شخص کو ساری مصیبتوں نے کیا ہمارا گھر ہی دیکھ لیا ہے جو افتادہ لڑکی ہے، وہ ہم پر آم کر رہی ہے۔“

اس نے سچے سچی ابراہی - رستم اور مریم نے ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔

اور کم رہا، اس سے ان کا مذاقوں کا امید رہی ہے۔ آخر مریم بھی تو ہے، اس کی دوستی کیوں نہیں تھی اس لڑکی سے۔ انسان کو یہ دوستیاں بھی کر دیکھ بھال کر پالتی جائیں، جہاں بڑا نظر آئے وہاں سے، اس پر کٹر گرفتاری محض مندی ہوتی ہے۔ بیٹے بٹھائے اچھی مشکل میں پھنس گئے ہم۔

”جگو.....“ مریم نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا ”اتنی فکر مند نہ ہو۔ جب ہمارا کوئی قصور ہی نہیں ہے تو ہم بلا وجہ کیوں اندیشے پالیں۔“

”تم نے اس لڑکے کی باتیں سنی ہیں ناں! چھٹا ہوا بد معاش لگ رہا تھا۔ میں نہیں  
تاصر کی مشکل میں پڑیں۔“

”خدا نہ کرے اور بدمعاش ہوگا وہ اپنی کلی کا۔ ہم سے اس کا کیا واسطہ۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدمی  
دفعہ اور آجائے گا ورنہ بھلا کیا ٹکڑے گا ہمارا۔“  
”نہلم کر سندی سے کچھ سوچنے کی تھی۔“

لاؤنج میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا، ہر چند کہ وہاں کئی افراد موجود تھے۔ سب ایک دوسرے سے نظریں جمائے اپنی اپنی سوچوں کے ہمار میں تھے۔

”ہمارے ارمان تو.....“ جناباکی نے ایک گہری آہ بھری۔ ”بہی میں مل گئے، کہی کسی کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہے، جیسا ہمارے ساتھ ہوا۔“

"بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ"

”بندے کو سر شکر کا دامن آتھ۔ نہیں چھوڑنا چاہیے کیا خیر، اسی میں ہماری کوئی بہتری چھپی ہو۔“

”جی ہاں۔ ٹھہرو ز نے جی سے کہا ”مختصر مدہ ہمارے کھر قدم رنجہ فرما کر یہ حرکت کرتیں تو..... بھائی جانان  
 بوہی بخانے کیا سوچتی تھی۔“



حق اور میرے لیے۔ وہ حکم

وہ ہو۔  
"اے الہی! بس تو ہی میرے پاس۔ جس میں میرے ہاتھوں میں الکلیاں تھیں۔ تو ہی ہمارا کردہ۔ خدا کی قسم یہ سب کون ہے"

میری ہن۔ چنگ جان سے  
 کہہ رہی ہیں۔ "وہ ذرا اونچا ہو کر سر کے بل سے لگا۔  
 "ہاں یا راجہ تو بے حد ضروری کام ہے۔"

مستردی -

مکرمایا "تمہاری باتیں میں نہیں سمجھوں گا تو اور کون سمجھے گا جس کو یہ دن اور انتقال  
 پہر، اتنا دہائیوں میں رہا۔" وہ "الکل حاتم۔"

”چند روز اور میری جان چند روز۔“ وہ گفتا یا تھا۔

”منع المالح-

”جی!۔ اس نے ابرو اٹھائے۔“

ہوئے اندر آگئے۔

پھوپھو کی دلیا درے۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ اس نے کانڈھے اچکا ہے اکیلے ہی آگئی ہوں رکھو۔۔۔

اسی لمحے ریاض بھائی مومند کو اٹھائے اندر داخل ہوئے تھے۔

اسلام - کہ وہ جیتا بیٹا ہے وہ تو میں رہا ہوں؟ میں شہنشاہ ہوں۔  
 ”کیسی باتیں کرتی ہو۔“ وہ شرمندہ ہو گئے ”اور سناؤ کیسی ہو، کہہ کر آتا ہوں۔“

”ایکلی ہی آئی ہوں۔“ وہ مسکرا کر اس کا گھبراتا دیکھ رہی تھی  
”آمنہ! یہ منہ کا منہ دھلا دو۔“ انہوں نے مودتہ کو آئینہ کی گود میں

کھانے کے بجائے منہ اور ہاتھوں میں مل لی ہے۔“  
 ”تو آپ کھلاتے تے۔“ شبنم ہنسی ”کیسے پاپ ہیں۔ بچی کو آپ کس کرم نہیں کھلا سکتے۔“

”بھئی وہ..... اے کام ان کی مال ہی کرتی ہیں۔ ہم نے تو کبھی نہیں کیے۔“  
آمنہ مومنہ کو لیے مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ ریاض بھائی نے دروازے پر کھڑے ہو کر اسے

فارم میں آگئے، ان کی آنکھیں مسکرا نے کا انداز بھی کچھ بدل گیا۔  
 ”بھئی! کیا زیادتی ہے! شبو کیوں کٹیفور کر رہی تھیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے اس کے آگے

”میں کئی روز رہی تھی۔“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں ”بجلا کس طرح؟“

وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے لگاؤٹ سے دیکھتی رہی، دل کے کسی کونے سے جو اسرار مآلا  
بول رہا تھا۔ آج اسے اس کی آواز بھی اچھی لگ رہی تھی۔

”اس قدر تجاہروں سے ایس ہو کر آئی ہو۔ بھلا کیوں؟“ انہوں نے اس کا ہاتھ قہراً لیے۔ وہ ان کی

”اگر کوئی آجائے تو۔“ ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ اطمینان سے پوچھنے لگی۔

”..... میں لہجہ دوں گا۔ میں کو بیسیریں پڑ رہا تھا۔ وہ زور سے اس دے دیے۔“  
”اے بیسیر۔“



[illegible]

کرنی کا ایک نمونہ ہے۔ وہ فاکس پر لکھا ہوا ہے کہ میری بیوی کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔

”آپ نے سر ہلایا۔“ فیبر تو کوئی نہیں ہے کیوں سر ہلایا؟“  
 ”آپ نے اسے میں نے استفسار کیا۔“ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

انہوں نے اسے اشارہ کیا "کسی بات پر۔" مکمل طور پر ایک عجیب و غریب سا تجربہ

”بھلا، اسے اسکراب بھیجی۔“  
”وہ ذرا سا کوئی بات نہیں ہے۔“  
”نہیں سزا لیا ہے کہ آپ کے اعزاز میں، کوئی عارضی ہے۔“

”کوئی تو نہیں دیکھی؟“  
”جینٹ! ارادہ رکھی؟“  
”نہیں! میرا ہاتھ نہیں آیا۔ آپ نے ہاتھ کیا ہے یہی بات ہے۔“  
”پیرا تھو دینا شاید آپ کو ہینڈ نہیں کیا؟“ وہ قدرے رک رک کر بولنا ”جین! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے  
”نہیں! میں نے ہاتھ تو نہیں کیا۔“

میں نے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ آپ نے واقعی مانگنا کیا تھا۔  
"اگر تو مجھ کو سطر سطر لکھی پھر لی رہی۔"

”خاناہوں۔ جی جی، میں غمگین ہوں۔“ وہ بے جا زبردہ نظر ہے تھے۔  
 ”آئی ام سوری میں۔“ کچھ اچھی۔“ ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ غلط کچھ رہے ہیں۔ کچھ تو یہ ہے کہ بہت مرے  
 ”دہلیں مرے۔“ وہ گھبرا اٹھی۔  
 ”مرے۔ کیڑے مرے کئی تھی۔“

”وہ ہے۔“  
 اپنی بلند بازی پر شرمندہ سی ہوئی تھی۔  
 ”کچھ ہا؟ کیا کہہ رہی تھیں آپ۔“ وہ اب دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔  
 ”اس کے الفاظ منہ میں رہی رہ گئے۔ دروازے پر دستک دے کر کاروائی صاحبہ انکو

”اے۔۔۔“  
 ”بس نہ! آپ جلد از جلد فائل مکمل کر کے مجھے دیں، ایک تو آپ ہر کام نہایت لیت کرتی ہیں۔“  
 وہ ہلکا ایک اس کے آفسر بن گئے۔ وہ درجہ اجنبیت درآئی تھی۔  
 وہی صاحب کی آواز میں اچانک ہی حد درجہ اجنبیت درآئی تھی۔  
 ”نہ! ان کے انداز پر حیران ہی رہ گئی۔“  
 ”مگر جھکا کر اپنی میز پر آئی تھی۔“

فلوری سے آکر وہ سیدھی اپنے کمرے میں کھس جاتی تھی لیکن آج اسے دروازے سے قدم اندر لگایا احساس ہو گیا تھا کہ کمرہ میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔

”تو نف رکھے!“

”انہوں نے ایک نگاہ اس کے گلابی چہرے پر ڈالی اور پھر نگاہ پٹنا کر اصرار دیکھنے لگے۔  
”اباس، ابو کی خواہش ہے۔ جلد سے جلد آپ کی اور بہنوں کی شخصیت کو دیکھیں گے۔“

والوں کا کئی مرتبہ فون آچکا ہے، وہ صبح پینے لے ہے اچھا چاہتے ہیں۔ ابو نے انہیں کل بلایا ہے۔  
 ”اوا۔“ وہ بے پیمان ہو گئی ”پھر رستا تو جاتی ملتی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔“  
 وہ چند لمحوں کے لیے غافل ہوئے جیسے کچھ کہا جا رہے ہیں اور اس کا شکریہ ادا کیا۔  
 ”اکیس بات کو سمجھ سکتا ہوں۔“ ان کا انداز سیڑھی تھا۔

“مصر و مصریوں کی تاریخ“

”جب آپ لوگوں کا ارادہ..... اتنی جلد ہی شادی کرنے کا نہ تھا تو میرا اتنی عجیب و غریب حال تھا کہ میں نے کہا کہ آپ پہلے گھر والوں کو استعفیٰ دے سکتے ہیں۔ کیا یہ موجودہ صورت حال کی نسبت بہتر نہ ہوگی؟“

ہے، کتنی سچی۔

”حیران! اپنے سوال سے جواب میں خاموشی پا کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔“ آپ کا، رضا کا جرنیل  
پر مہرام ہوا، اسے ڈس کس تو کیا خاک کا، آپ ایسا کریں۔ اسے آج شام کو بلا لیں۔“

”بھئی عشان! ایک منٹ پیڑ۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اکیں جانے سے روکا۔ ”درا پیڑ کھرہ کی بات سن لیں۔“ وہ جانتی تھی کہ اگر اسے اس کھر میں اپنی کوئی بات مڑانی تھی تو سب سے پہلے عشان کو اجازت مل لیتا۔

“

”کوئی نہیں۔ آپ بچا جان سے کہیں، مہناز کی رخصتی کر دیں ہمارا مسئلہ بعد میں اٹھایا جاسکتا ہے جب ہی طے کر رہنا اچھی خانگی زندگی کی ذمہ داریاں افرار نہیں کر سکتے۔“

”وہ تجھ کو اپنے ناخن دیکھنے لگی۔ بجانے کیوں عثمان سے یہ بات کہتے ہوئے اسے شرمندگی سے محسوس ہوتی تھی۔“ آپ ہلیز میری پرالم جیسے کی کوکوش کریں۔ اس گھر میں آپ واحد فرد ہیں جو میری بات غور سے سن لیتے ہیں۔ آخر میں نے اپنی پسند سے نکاح ہی تو کیا ہے۔ ایسی کیا قیامت آگئی جو سب کے سب یکا یک مجھے اس گھر سے نکالنے کے درپے ہو گئے ہیں۔“

عثمان کے لبوں پر عجیب سی سکرابٹ در آئی۔

”جی ہاں۔ کہہ تو آپ درست رہی ہیں۔“ پھر وہ بولے ”کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا ہے، امریکہ میں ایک طویل عرصہ میں نہیں آپ گزار کر آئی ہیں۔“

”ہیلز! یہ طوطا کا وقت نہیں ہے۔“ اس نے احتجاج کی محسوس کی۔ ”آئی نیڈ یور ہیلمپ۔“

اے۔۔۔ وہ طرے ہوئے سبب یا جان سے بات رستا ہوں، دیتے ہیں۔ کیا صورت حال بنتی ہے۔“

”وہ حالات رک گئے تھے، دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے غلط کر دیکھا۔“

”جی کہے کیا کہہ رہی تھیں آپ؟ کہا جانے ہوئے؟“

کچھ نہیں۔۔۔ وہ دوسری جانب دیکھنے لگی۔

بے فکر رہیے الماس! پیرے دل میں جو جذبہ ہے آکر مرے نہیں ہیں تب بھی میں نے انہیں زخم







335

وہ بے رحم "م" سے زور دیتی تھی۔ "مگر میں میں کانٹوں۔ یہی  
"میں خوش رکھ۔ ٹیک بات دے۔ خوش دے۔"  
"مگر خدا جانتا ہے کہ میں ایک رات ایک لے کر میں بندہ ہوئی تھی۔ سوچ سوچ کر مصائب ٹپ ہو گئے  
اس کی ہمت تھی۔ قدرت ہی منہ زور، طاقت ور ہے کے متعلق اس کا کوئی زور و جود ہے۔ بس وہ ہے  
وہ ہے جواب دے گئے۔ حاشا کر رہا تھا۔

ذاتِ احمہ نہیں کیا جو کے ساتھ "الیم ذی

”ہاں کے“ بیچ جیکری جاتے ہوئے ان کی کھنٹھیں اٹھنے لگیں تھیں۔ موہنی بھی اسی طرح تھیں۔ انکا ”ہاں“ ہے چاہی بھی کہیں۔“ مریم انفرسکی سے بولی، ”تم سرسرا کر ان کے حوصلے بھی جھکاب دے گئے ہیں۔“

”ہاں“ بھی کہیں وہ۔“ اعلیٰ اپنے بیٹے کو اٹھا کر ہوئے ہیں۔ انسان سچ ہو جاتا ہے۔“

”تم کا دل بوجھ رہا۔“ ریشم نے چلیٹ کر کے دیکھا۔

جس نے کچھ ہوا اس میں جھکا کیا تصور؟۔“ ریشم نے چلیٹ کر کے دیکھا۔

”میرم نے سرجھکا لیا۔ اماں سے تنہم آہی کا دھوکہ نہیں دیکھا جاتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ  
”نہیں۔“ کچھ نہ کچھ ہاتھ مضروں تھا۔ آخر انہیں کیا پوری محنتیں آہی کے ساتھ اپنا غلاب منڈھ رہے  
”نہیں۔“ کچھ نہ کچھ ہاتھ مضروں تھا۔ آخر انہیں کیا پوری محنتیں آہی کے ساتھ اپنا غلاب منڈھ رہے  
”نہیں۔“ کچھ نہ کچھ ہاتھ مضروں تھا۔ آخر انہیں کیا پوری محنتیں آہی کے ساتھ اپنا غلاب منڈھ رہے

[illegible]

میں نے کہا کہ "خداوند کرے۔" مریم نے اسے کھوڑا۔

”خدا نہ کرے۔“  
”نہی اب اچھا خاصا سمجھدار ہو گیا ہے۔ اسے گھر کے مسائل کو سمجھنا چاہیے۔“

”ابھی وہ پڑھ رہا ہے رات کم ہے۔ اور پھر اس عمر میں یہ چھوٹی سونٹی سی نہایت قوی زندگی کا حصہ ہونی چاہیے۔ بجو بھی نہیں چاہئیں کہ وقار بھائی کی طرح وہ انہی سے اپنے کاموں پر اتنا توجہ کرنے لگے کہ جوانی میں ہی بوڑھا ہو جائے۔ یاد ہے، وقار بھائی چھوٹی سی عمر میں ہی اتنے بخیلہ ہو گئے کہ وہ کسی کو قائل توجہ نہ دیتے تھے۔ کبھی خود پر ایک پائی خرچ نہیں کرتے تھے۔ اپنا من مارنے کے اس غلط فہمی کے کوئی طلب ہی نہ رہی تھی انہیں۔“

نذر مال کی ہوئے۔ اور اب جو بھی وقتا بھالی شتی جا رہی ہیں۔ ”رہیم کی آنکھیں بھائی کے ذکر پر ابھر آئیں۔ ”تم مال کو“

محبوبان! اگرچہ یہ سب کچھ  
 "پتھر آبی کی زندگی میں خوشیاں آجائیں اور وہ اور یوسف بھائی ایک ہو جائیں تو اللہ ان میں کچھ  
 موعود حکم ہو جائے گا۔" اس نے بہن کو لولا سا دیا۔

”یہ تک تو اماں بچو کو زبردستی رخصت کر دیں گی۔ مجھے تو یہ لوگ بالکل پسند نہیں ہیں مگر آج کسی کس طرح کی باتیں کر رہی تھیں بچو سے۔ اگر بچو کی شادی وہاں ہو گئی تو۔“ وہ دہل دہل کر خود

جہاں وہاں سے ملے گی۔

دروازوں میں بیٹھیں اپنی اپنی سوچوں میں کسم کاٹنے والی سے کلام کرنے لگیں۔

• • •

فون کی بیل کلانی دیر سے بیچ رہی تھی۔

ہا سلندی سے اٹھ کر فون تک آئی تھی۔

اک دیا جلائے رکھنا

بستر پر پڑی ہوں اور تم چہرہ در پہ اپنے کے لاش ہو گئی ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نے مجھ کی اور میں نے تمہاری جگہ لے لی ہے اور تم ہر فیصلہ اپنی مرضی سے بنائیں بالا کر سکتی ہو۔ اگر ایسی کہنی بات کہ تم مجھ سے اسے ذکر کر دینا چاہیے تھا۔ بلکہ اول تو یہ کہ جو لڑکیاں گھروں سے کہانی کے لیے باہر نکلتی ہیں، انہیں اس وقت میں پہلے اس حوالے سے احتیاط ہونا چاہیے کہ کسی اور کو ان کے گھر میں کچھ کہنے سننے کا حوصلہ نہ ہو سکے۔ ”اپنا ذاتی کام“

”اے! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ اس کے اعصاب متجذب ہونے لگے تھے۔ ”اے! تم“

ایک کوئی بات نہیں ہے۔  
"جوہر" وہ سخت مختصر ہو گئیں۔  
کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں کر کے یہ

سادہ اس قدر میں پیدا ہوئی۔ اس کا بڑا دل پر کھینچ کر ہر قسم کی ہمتوں پر چھوڑ دیا۔  
 ہے۔ دن رات اسی بے زبان کے آنسو ہرے دل پر گرتے ہیں۔ مجھے بلبلوں کے آواز سے ایں آواز سے گھبراتا  
 ہو۔ پس پردہ جو کچھ کہتی ہو۔ اس کا آخر کرتے وقت تمہاری جراتیں کہاں جا کر موقوف ہیں۔“  
 ”اے! وہ بے رحمی سے انہیں دیکھتی رہے گی۔“

رجم اور سرجم اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

”ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں میں مت ایسے غور نہ کیجئے۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ تم اندر ہی اندر ایسے میاں سے راز و نیاز کر رہی ہو تو پہلی فرصت میں تمہارا نکاح الٰہ سے پڑھوا دیتی۔ چاہے تم کتنا ہی اندر ایسے تم نے تو مجھے کسی کی کو بھی ہوا کہ نہ کہنے دی۔ جانے اس میں تمہاری کیا مصیبت پوشیدہ تھی۔ شاید وہ تمہارا سر سے اتر گئے تھے اور تمہیں کچھ نہ سوجھا تو میری موصوم چشم کو اپنی مصیبتوں کی جھینٹ چھایا۔“

اسے پکڑ آنے لگے تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”اب پھر تم نے وہی کھیل کھیلا ہے۔ ارے کیسی

کر دوسروں کی پیشکش پر الزام تراشیاں کرتا پھرے۔ رانی ہوئی ہے تو پہلاز بشتا ہے تاں۔ اور تم نے خود انرا کہا کہ تم اس لڑکے کو بچپاتی ہو۔ اور یہ کہ وہ تم کو سر راہ چھڑتا ہے۔ ارے ذرا فی غیرت ہوئی تو تم کیا مٹاؤ گے؟ کہتیں؟ مجھ سے ذکر نہ کرتیں۔ لیکن بڑے بھائی کے بعد تم تو ایسی ہے لگام ہوئی ہو کہ تمہیں کسی انتہا سے کسی تیز ہی نہیں رہی۔ تمہارے دیدلوں کا تو پانی مر گیا ہے۔“

دہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کے بڑے نصیب لمحے تھے وہ کتنی سیاحیاں اس کے مقدر میں بھر چلے تھے۔ اس کی ہر ملامت اس سے اس قدر بدگمان ہوئی تھی کہ وہ کوئی مافی دُشمن ہوتا۔ اپنی مصائب میں کہنے کے لیے جتنے لفظ اس کے پاس تھے سارے کے سارے آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلتے تھے۔ یوں ہر شخص بڑھ گئے تھے۔

”میرے پاس تو ان سارے سکوں کا ایک ہی صلہ ہے، ہم! کہ میں جلد از جلد تمہیں اس کو واپس کر کے زندگی کے باقی دن کچھ سکون اور عزت سے گزار لوں۔ جانے آ کے تمہارے کیا ارادے ہیں۔“

”وہ عورتیں بھی اپنی ٹوٹی اور مرضی سے نہیں آئی تھیں۔ اس لڑکے نے مجبور کر کے بھیجا تھا انہیں ان کے

اب برا بھلا جیسا ہی ہے، سمجھو اسے اپنے اعمال کا احساس ہے۔ میں نے تو انہیں ہاں کر دی ہے۔ جب چاہیں  
مگر تمہیں لے جائیں۔“

”اس کی آنکھیں حسرت اور صدمے سے پھٹ گئیں۔“

”ہاں!“ اس کے کانپتے لبوں سے بس اتنی ہی نکلا۔



بسم الله الرحمن الرحيم

[illegible]

”جی ہاں! یہ سب کچھ سہولتیں ہیں۔ یہ ہم نے اپنے پاؤں سے کر دی گئی ہے۔“  
 ”یہ بھی اہل سماج اور مذہب کے لوگوں سے چھینے گئے۔“

انال ہامی کی آواز ہے۔ اختیار کھڑا ہوا تھا۔

اے جی! یہ سب کچھ تو آپ نے پہلے ہی بتا دیا ہے۔ میں نے تو صرف اس کے مطابق کیا ہے۔ اس نے مصالحت کے لیے آجوا کے کیا۔

”وہ“ وہ“ شہر ہزاروں سال پہلے کا تھا۔  
”وہ“ وہ“ شہر ہزاروں سال پہلے کا تھا۔  
”وہ“ وہ“ شہر ہزاروں سال پہلے کا تھا۔

”کی۔“ میں نہیں چلوں گا ہمارے ساتھ۔“ ساجد علی سے بول پڑی۔  
 ”یہیں نہیں فرماؤ تم بھی چلوں گا اس کے ساتھ شہر کرنے آیا تھا۔ اسے اس طرح چھوڑ کر  
 ”وہ جانتی تھی، وہ اس وقت اپنی اداسی اس کے ساتھ شہر کرنے آیا تھا۔ اسے اس طرح چھوڑ کر  
 ”وہ جانتی تھی، وہ اس وقت اپنی اداسی اس کے ساتھ شہر کرنے آیا تھا۔ اسے اس طرح چھوڑ کر

میں جنوں کا۔۔۔ وہ سکرایا۔

"ارے نہیں۔" دانیال جویز آ پ ال سے کہتا تھا۔ یہ بھی ہمارے ساتھ چلے۔  
"کہتے ہیں" مجھ کو، "ہاں۔ ابھی نہیں۔"

”بھئی، اگر یہ جانا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس سے ہمارے بچاؤ کیلئے۔“

ہرگز۔ تمام تر انداز کہہ رہے تھے کہ وہ اسے ساتھ لے جانے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔  
 ”دانیال! تمھی“ شہرہ ز نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”کچھ ملیں گے۔“

”او کے دماغ میں صدمہ ہے۔“

”پھر بھی سہی! یوں بھی آپ میرا سوڑ قلعہ ایسا نہیں کہ آپ لوگوں کو اچھی کمٹی دے سکیں۔ خزانہ آہ آپ“

وہاں کی کھیتی باڑی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

“الحال،

اور جب کہ علے جانے کے بعد وہ اس کی سمت مڑا تھا۔

”جواباً کہ یہ ایک تاریکی کے لئے ہے“

"اب اب مرید ہست۔ سنا یہ ہے کہ اس کا دل نے خدا کو اس سے پہچان لیا تھا۔"

"آپؐ میں! میں پُتے کے کردہ اندر کی جانب چل دی۔"

”مسکلت کے تقاضے بھی بسا اوقات سمجھ سے باہر ہوتے ہیں۔“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”شہرزدہ دلس ناگہم رائیڈ مارتا ہے، اس کا دسواں حصہ بھی وانیال ہاشمی کی میسر نہیں۔ پھر پوری آج اس شخص کا کہنا ماننے کی کیا

”بھلو“ اس نے سوئی سوئی آواز میں کہا۔

”السلام علیکم۔ دوسری جانب سے قدرے شوق سے کہا گیا۔“ کہیے! کیسے حراج میں۔“  
”الحمد للہ۔“ وہ آواز پچھان کر آنکھی سے بولی۔” آپ خیریت سے ہیں؟“  
”بالکل۔“ وہ ہنسا۔ ”صرف خیریت سے بلکہ قدرے فراغت سے بھی۔ آ۔“

ذرا -  
"جی،" "نہیں جی" کے لئے تھک چکی۔

”بس تو پھر میں آ رہا ہوں۔ ذرا آؤ شک کے لیے چلتے ہیں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں کہا۔

کوئی تباہت ہے۔" وہ مجھے رستہ پر رکھتے رکھتے وہ کیا تھا۔ "کہیں اور کا پروگرام ہے۔"

”ڈرنٹ درکی۔ وہ ہنس دیا۔“ یہ میرا کام ہے میں خود ہی سرانجام دے لوں گا۔ آپ کو یہ بتانا ہے۔

اس سے پہچنے کر وہ کچھ کہتی، وہ فخرانہ بند کر چکا تھا۔ ایک سوچ میں ڈوبی ہوئی وہ واپس کر سے ملنے لگی تھی۔  
 "کتنی مضاد ہیں ہماری شخصیات۔"

وارڈ روب کے سامنے کھڑی ہوئی عاتب دماغی سے کٹر دل پر نگاہ دوڑا رہی تھی۔

”یا شاید مجھے ہی ایسا لگتا ہے۔“  
”صاحبی! پیچھے سے مجرم خاتون نے پکارا تھا۔“

”جی ای؟“ وہ چوٹ کر مڑی۔

شہر ز آ آیا ہے۔۔ نیچے لان میں بیٹھا ہے۔۔“

سہرہ آریا ہے۔“ وہ گل اُٹھی۔ ”اچھا میں آتی ہوں نئے دن کے بعد قسم توڑی ہے اس نے۔“  
تین کی سے ٹھہراں بھلائی اتر آئی۔

ہام کے بڑے سے ملے کے پاس کھڑا کسی سوچ میں گم تھا۔

مستکراتی ہوئی اس کے سامنے آگئی۔

”السلام علیکم“ وہ ادا ہی ہے مگر کیا۔ ”کسی ہیں؟“

”وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ! مَثَلُ تَوْبَاكُلٍ خَيْرٌ مِنْ مَثَلِ هَؤُلَاءِ

اور کہتے دن بعد آئے ہو۔ راستہ بھول تو نہیں گئے تھے؟“

”بس۔ موڈ ہی نہیں بن رہا تھا کہیں آنے کا

”اے خداوند! بعد آج کو بندگی کرنا تھا۔“

”یہ تو بہت بری بات ہے۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ”اور یہ تمہارے موڈ کو ہوا کہا ہے؟“

”اور کیا کروں۔“ اے وہ زنج ہوا۔ ”بے وجہ خوش رہ رہ کر اتنا گیا ہے دل صاف! اس تو

”میں لکنا ہے ادا سیموں نے ہمارے ہی کھر کا راستہ دیکھ کر رکھا ہے۔“

۱۔ اے نہیں کہتے سحر و زنا“ وہ سجدہ ہو گئی۔ ”ہر کام میں خدا کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتا ہے۔“

۱۱۔ حالانکہ ادا کرنا ہی میرا قصور رکھا ہے۔ ”

سید احمد علی خان



مستطیل و مثلثی را انجام

جیسے لڑکھوں نے دانت چبکے۔ تم ایک ایک راز سے واقف ہوا اس کے پہلے ہی کسی سے دوستی نہیں کی تھی۔ اگر تم نے مخالفت کی زبان نہیں کھینچی تھی تو تمہارے حوالے سے وہ "وہ بھڑکے لیے رک رک کر لڑا اور دھمکینے لگا۔" جی ہاں کرتی آتی ہے۔

۱۱۔ "میں نے اپنے لیے ایک عورت اور عورت اگر عزیز ہے، تو مجھے نہیں۔"

دوست! میرا سچے ہو مران دوستوں بڑے سے ہے۔ ان کے لک مار بڑیک اسطرش کی

۱۱۱ میں غائب ہوئے۔ چہرہ ڈھانپ لیا، اور زمین پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا لگا۔

۱۰۹۔ کیا بات ہے، نبی! — سر پر ہاتھ نہ رکھو، وہ درگاہِ حق پر ہاتھ نہیں رکھتا۔

اس نے کہا کہ آج کل کے کرکٹ کھلاڑیوں کو

محاش پڑے شیر ہوئے ہیں۔

وہ چادر سے منہ صاف

۱۱۔ اے "بروین" اے جگنے آلی سی۔

”ایمان ہے۔“ اسی کے بزرگوں سے پہلے۔

”نہاں کر“

میں نے تو خود بھی مرتبہ دیکھا ہے الٹیں۔ بلاے جو مصورات سے الٹا

”مستی خیر انداز میں سرائی۔“

”اوہ! رضا؟۔ اے بڑی و درویش دوست۔“

ابن عربیؒ کے آثار و تصانیف کی حیرت انگیز تفسیر و تشریح

”مذکر ذات“ — الماس کو اس سے عجیب سی چمکس ملتی۔ ”ذرا سی بات جان لے خود کو مجھ سے“

۴۲۲ ذرا کرنے لگتے ہیں۔

اس نے بڑی جلت میں

میں خود کو بہا لے رہے ہیں۔

دریغ در این عالم

دلاور خان اور عثمان خان باہل ساہیہ

اک دیا جائے، رضا

گامزئی تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی کی اور وہ ادا کی سے پیچھے کو بھاگتی سڑک پر

کراے دیکھا۔ ”آپ کی صورت پر برسی پریشانی دیکھ کر کوئی بھی پوچھنے سے انکار کرے گا۔“

”بجہ اہل قہر کم گوئی میرے ساتھ حق حال نہیں کرتا۔“

انگل آئی نے مجھے زبردستی تو آپ لے کر تیں منڈھ دیا ہے۔" اس نے فک کا ایک ادا کر کے

ان کے لئے میں تمہیں سے شکایت تھی۔ ورنہ ان کے ذرا تو اسرار کر سکتے۔

جہاں لوہے سے بنی ہوئی ہو وہاں لوہے سے بنی ہوئی ہو۔

”دانیال صاحب!“ اس کے لہجے میں سختی درآئی۔ ”وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔“

سورۃ:۔۔۔ میں نے وہاں پہلے جدیبات کا اظہار کیا ہے۔ احساسات تو خود بخود

”صاحبِ غالب دانتوں سے کاٹ کر رہ گئی۔“

ہیں! اسی ام سوری۔ اس کے قارات دیکھ کر وہ جلدی سے بچہ بدل کر "ا

۳۲

وہ شوق پر اتر آیا تھا۔ اور وہ اس کے الفاظ کی ڈور میں بندھی کہیں مجھے پہنچ جائے۔

عن دم بریں۔ سب سے اعلیٰ اور سرفرازی کی سی۔ آپ کے چہرے پر مسکراہٹ

ن کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اور یوں ہر ایک اور اس کے سر پر دھندلا گیا۔

نیال ہاٹی سٹی پر کوئی دھن بجاتے ہوئے کیسٹ پلیئر میں کیسٹ لگا رہا تھا۔

...

۵۵- سر پہنے جلدی اپنی کمی کراہنے

قدرے کر مٹا اور عین سر بر جھکتے سورج نے اس کے کالموں پر کلا بجھا ایتنا :

ی۔ جی کی نے اس کے آگے بائیک روک کر اس کا راستہ بند کر دیا۔

۷۰۰  
۷۰۱  
۷۰۲  
۷۰۳  
۷۰۴  
۷۰۵  
۷۰۶  
۷۰۷  
۷۰۸  
۷۰۹  
۷۱۰  
۷۱۱  
۷۱۲  
۷۱۳  
۷۱۴  
۷۱۵  
۷۱۶  
۷۱۷  
۷۱۸  
۷۱۹  
۷۲۰  
۷۲۱  
۷۲۲  
۷۲۳  
۷۲۴  
۷۲۵  
۷۲۶  
۷۲۷  
۷۲۸  
۷۲۹  
۷۳۰  
۷۳۱  
۷۳۲  
۷۳۳  
۷۳۴  
۷۳۵  
۷۳۶  
۷۳۷  
۷۳۸  
۷۳۹  
۷۴۰  
۷۴۱  
۷۴۲  
۷۴۳  
۷۴۴  
۷۴۵  
۷۴۶  
۷۴۷  
۷۴۸  
۷۴۹  
۷۵۰  
۷۵۱  
۷۵۲  
۷۵۳  
۷۵۴  
۷۵۵  
۷۵۶  
۷۵۷  
۷۵۸  
۷۵۹  
۷۶۰  
۷۶۱  
۷۶۲  
۷۶۳  
۷۶۴  
۷۶۵  
۷۶۶  
۷۶۷  
۷۶۸  
۷۶۹  
۷۷۰  
۷۷۱  
۷۷۲  
۷۷۳  
۷۷۴  
۷۷۵  
۷۷۶  
۷۷۷  
۷۷۸  
۷۷۹  
۷۸۰  
۷۸۱  
۷۸۲  
۷۸۳  
۷۸۴  
۷۸۵  
۷۸۶  
۷۸۷  
۷۸۸  
۷۸۹  
۷۹۰  
۷۹۱  
۷۹۲  
۷۹۳  
۷۹۴  
۷۹۵  
۷۹۶  
۷۹۷  
۷۹۸  
۷۹۹  
۸۰۰  
۸۰۱  
۸۰۲  
۸۰۳  
۸۰۴  
۸۰۵  
۸۰۶  
۸۰۷  
۸۰۸  
۸۰۹  
۸۱۰  
۸۱۱  
۸۱۲  
۸۱۳  
۸۱۴  
۸۱۵  
۸۱۶  
۸۱۷  
۸۱۸  
۸۱۹  
۸۲۰  
۸۲۱  
۸۲۲  
۸۲۳  
۸۲۴  
۸۲۵  
۸۲۶  
۸۲۷  
۸۲۸  
۸۲۹  
۸۳۰  
۸۳۱  
۸۳۲  
۸۳۳  
۸۳۴  
۸۳۵  
۸۳۶  
۸۳۷  
۸۳۸  
۸۳۹  
۸۴۰  
۸۴۱  
۸۴۲  
۸۴۳  
۸۴۴  
۸۴۵  
۸۴۶  
۸۴۷  
۸۴۸  
۸۴۹  
۸۵۰  
۸۵۱  
۸۵۲  
۸۵۳  
۸۵۴  
۸۵۵  
۸۵۶  
۸۵۷  
۸۵۸  
۸۵۹  
۸۶۰  
۸۶۱  
۸۶۲  
۸۶۳  
۸۶۴  
۸۶۵  
۸۶۶  
۸۶۷  
۸۶۸  
۸۶۹  
۸۷۰  
۸۷۱  
۸۷۲  
۸۷۳  
۸۷۴  
۸۷۵  
۸۷۶  
۸۷۷  
۸۷۸  
۸۷۹  
۸۸۰  
۸۸۱  
۸۸۲  
۸۸۳  
۸۸۴  
۸۸۵  
۸۸۶  
۸۸۷  
۸۸۸  
۸۸۹  
۸۹۰  
۸۹۱  
۸۹۲  
۸۹۳  
۸۹۴  
۸۹۵  
۸۹۶  
۸۹۷  
۸۹۸  
۸۹۹  
۹۰۰  
۹۰۱  
۹۰۲  
۹۰۳  
۹۰۴  
۹۰۵  
۹۰۶  
۹۰۷  
۹۰۸  
۹۰۹  
۹۱۰  
۹۱۱  
۹۱۲  
۹۱۳  
۹۱۴  
۹۱۵  
۹۱۶  
۹۱۷  
۹۱۸  
۹۱۹  
۹۲۰  
۹۲۱  
۹۲۲  
۹۲۳  
۹۲۴  
۹۲۵  
۹۲۶  
۹۲۷  
۹۲۸  
۹۲۹  
۹۳۰  
۹۳۱  
۹۳۲  
۹۳۳  
۹۳۴  
۹۳۵  
۹۳۶  
۹۳۷  
۹۳۸  
۹۳۹  
۹۴۰  
۹۴۱  
۹۴۲  
۹۴۳  
۹۴۴  
۹۴۵  
۹۴۶  
۹۴۷  
۹۴۸  
۹۴۹  
۹۵۰  
۹۵۱  
۹۵۲  
۹۵۳  
۹۵۴  
۹۵۵  
۹۵۶  
۹۵۷  
۹۵۸  
۹۵۹  
۹۶۰  
۹۶۱  
۹۶۲  
۹۶۳  
۹۶۴  
۹۶۵  
۹۶۶  
۹۶۷  
۹۶۸  
۹۶۹  
۹۷۰  
۹۷۱  
۹۷۲  
۹۷۳  
۹۷۴  
۹۷۵  
۹۷۶  
۹۷۷  
۹۷۸  
۹۷۹  
۹۸۰  
۹۸۱  
۹۸۲  
۹۸۳  
۹۸۴  
۹۸۵  
۹۸۶  
۹۸۷  
۹۸۸  
۹۸۹  
۹۹۰  
۹۹۱  
۹۹۲  
۹۹۳  
۹۹۴  
۹۹۵  
۹۹۶  
۹۹۷  
۹۹۸  
۹۹۹  
۱۰۰۰

“عزیز من”

میر سے کہوئی عرض نہیں ہے لڑکا! ” اور خالما ” اکتا تو غنا کا کہہ لے گا کہ ”

میں نے کہا کہ اس نے کہا کہ اس نے کہا۔

- نئے پتہ میں جا! اس لئے مجرا رادھما دھرم دیکھتا۔



341

سکرائے۔ "فریسا صاحب! جب اللہ کی ہر طرف کے حالات میں آپ کا ساتھ ہونا ہے۔" جہاں آپ ہاتھ نہیں پھرتے، ہاں اللہ کو بھی اپنے ساتھ رکھیں۔

آپ کہیں سوچا رہے ہیں کہ پہلے تو ہر آزمائشوں کا بخیر و برکت

عبداللہ بن عمرؓ کو لے کر جا رہے تھے۔ عثمان خان ضرورت سے روایہ دے کر بچھڑ گئے۔  
 مالک بن نوید کاٹنے لگے۔ وہ میرے سرزنشوں سے بچنے نہیں سکتا۔ وہ مالک بن  
 جس طرح کے اہول میں یہ لپٹا بیٹھ گیا ہیں۔ وہ اس سہارا میں تو میں بہت جلد۔  
 اٹھا ہوں اگر آپ لوگ مجھے ورنہ سہارا دیں تو میں بہت جلد۔

کہا "دینا صاحب"۔ جن جان لے اس کی بات نہ کی۔" یہ بات تو بالکل درست تھی۔ غصہ بڑھ کر اس کے اس فیصلے نے ہمارے پورے گھر کو ایک گھم-گھم سے دوچار کر دیا۔ اگر کہہ سکتے ہیں تو اس کا یہ مطلب بالکل بھی نہیں ہے کہ ہمارے بڑوں کے دل سے یہ صدمہ کم ہو گیا ہے۔ اگر یہاں پہلے ہی آپ کو یہاں بلایا گیا چند باتیں گلے کرنے کے لیے۔ بلکہ بات یہ کہ پہاڑ کے ساتھ لاس کے ساتھ رہ رہے ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ لاس کے بزرگوں نے سزا کے طور پر انہیں کچھ کمزور دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ صرف اور صرف لاس کو لے کر جائیں گے۔ محض اس ایک لباس میں جس میں پہلے وہاں سے صرف پینٹس تھیں۔ آپ دونوں نے اپنی زندگی خود شروع کر لی ہے۔ خود آئے یہ مصلیٰ ہے۔ آپ کوئی چیز، کوئی ٹیک پینٹس نہیں۔ جیکہ رضا کا جہاز خفیہ ہو گیا تھا۔ کوئی چیز، کوئی ٹیک پینٹس نہیں۔ جیکہ رضا کا جہاز خفیہ ہو گیا تھا۔

”جیسا کہ صاحب! میرے پاس ان کو دینے کے لیے فی الوقت کچھ بھی نہیں ہے۔“

”بھئی سناں۔ کو نکاح سے پہلے سوچتی تھی۔“

"بات آپ کو سن سے چٹوڑی ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اگر آپ لوگ مجھے اپنا "بھتیجیا" نہ سمجھیں، آپ کے اپنے خاندان کی عزت ہے۔ مجھے ذرا سا بہادر دے دیں تو اس میں آپ کی اپنی عزت ہے۔ اپنے گھر کا ایک فرد قرار دیتے ہوئے، مجھے ذرا سا بہادر دے دیں تو اس میں آپ کی اپنی عزت

”بیکار مہی ہے۔“ ”یہاں“ ”دلاور چکا بلو لے گئے۔“ ”کیا چاہتے ہو تم۔“

”بی بی جان! آپ کا اتنا بڑا بزنس ہے۔ آپ مجھے اس میں شریک کر لیجئے۔ کسی ایسے شخص سے معاوضہ پر فائز ہو رہی ہوں کہ جس نے مجھے باہر بلا لیا۔ میں بہت جلد اپنے حیدر آباد کے مکان پر چلا جاؤں گی۔“

کر رہی تھی۔ تاکہ اگر مولانا صاحب سے مل سکیں۔

"میرا سہرا میرا ہے۔" الماس سے نکاح اسی لیے تو ہمیں کیا کھا آپ نے؟

مردانہ کھڑا ہونے کے لیے۔  
 ”جی، بخدا نہیں۔“ وہ بوکھلا گیا۔

”ہاؤ اسٹاپ اٹ۔“ الماس کھڑی ہوئی تھی۔

ہی ہوں۔ آپ کا پورا کھیل میری سمجھ میں آ گیا ہے۔  
 کہہ رہی ہوں کہ وہ لیسٹر ایسٹن افسر ہونا چاہیے۔“

اے ہیں۔ اب وہ پوچھا، "رضا بولا تھا۔"

”کسی کو کچھ سمجھا جانے کی ضرورت نہیں ہے رضا۔“ وہ اس سے بولی پھر مگر عثمان سے مخاطب ہوئی۔  
 ”آپ کی ساری شرائط میں منظور کرتی ہوں۔ مجھے آپ کے والد کی جائیداد یا بیگم پنشن میں سے  
 کوئی چیز کے نام پر کسی شے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ میں انہی ادویات اور اسی وقت اپنے شہر کے ساتھ  
 رہوں گی۔“

راشدہ حکم اور عاصمہ بچی قدرے فاصلے پر کھڑی تھیں۔

”وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان تک پہنچی۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔  
”کسے عورضا؟“ وہ سکرانی۔

فَقَاتِلْهُ يَا دُوَّحِي سَكْرًا يَا -

ہاں نے محسوس کیا۔ اس کے اعصاب نہایت کھیدہ تھے۔ وہ بے حد کھیرایا ہوا ملک آباد تھا۔  
 بیٹھوٹاں! "وہ اسی صوفے پر خود بھی قدموں سے فاصلے پر بیٹھ گئی۔  
 بیٹھوٹاں! "وہ اسی صوفے پر خود بھی قدموں سے فاصلے پر بیٹھ گئی۔

نہیں ہے۔ اگر اسی طرح رہے تو وہ دوسری جگہ پر بھی نہیں رہے۔

”مہم بہادر امی انتظار کر رہے تھے الماس بی بی،“ بالآخر دلاور پچھا نے خاموشی توڑی۔ ”مہم بالآخر میں ہر بات تم دونوں کے سامنے ہی طے کی جائے۔ بعد میں تم کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔“ انہوں نے بات کے اختتام پر عثمان خان کی جانب دیکھا تھا۔ گوا جا نا۔ بھوج

۔۔۔ پتہ سی سی، دوستان خانہ کے  
کے بڑے صالحی۔  
”بھیس رضا صاحب!“ عثمان خان نے حیرت سے کہا۔

اپنی زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ لیکن جس طرح پتے کو آپ نے اور الماس نے مل کر ہمارے گھر کی روایات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آپ سے باز پرس کرنے کا شاید ہمارا حق نہ بنتا ہو کہ ان الماس وہ گھرانے کے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی خاندان کا ایک فرد ہیں۔ ان کے اس خود بخود رائے فعل سے ہمارا پورا خاندان ایک شاک سے دوچار ہوا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ مجھ سے منسوب بھی تھیں۔“

-6-13 p. 505

ان کے اس افتاد

والوں کو اس تمام صورت حال سے بے خبر رکھنے کی ہم سب نے پوری کوشش کی لیکن ایسی باتیں تو ہم حال اپنا دینے خود بخود ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔ اس لیے ہم لوگ چاہتے ہیں کہ قبل اس کے یہ بات مزید کئی دھڑوں میں دیکھ کر پھیلے۔ ہنذا اور الماس کی رشتہ منقطع کر دی جائے۔“

”خاص م!“ رضا کو ماہوا۔ ”مک!“

دراصل ہم دونوں خوفزدہ تھے۔ اس نسبت سے جو آپ دونوں کے درمیان قائم کر دی گئی تھی۔ بے یقینی کی کیفیت میں جو راستہ ہم دونوں کو نبھنا بہتر لگا۔ وہ ہم نے اپنایا۔ آگے کیا کیا مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں، اس کا ہمیں اتنا اعزاز نہ تھا۔ خصوصاً مہناز کے حوالے سے تو ہم نے سوچا ہی نہ تھا۔ لیکن جہاں تک الماس کی رصحتی کا سوال ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ میں آج کل معاشی اعتبار سے نہایت کمزور ہوں۔ یہ مسئلہ کسی طور حل ہو جائے تو مجھے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔“

”مس کی

صاحب! الماس نے جس قدر آپ کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ آپ کے حالات سے پوری طرح سے واقف تھیں۔ اس لیے ہمارے خیال میں انہیں اب اس بات پر بحث کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ کہ شادی کے بعد آپ لوگوں کا طرز زندگی اور معیار زندگی کیا اور کیا ہوگا۔“

”میں نے کبھی اس بات پر بحث کی بھی نہیں۔“ الماس فقط برہمی سے بولی تھی۔  
نجانے کہاں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ عثمان خان دانستہ رضا کو پریشان کر رہے تھے۔







”ہماری فرمائش بر کے سامنے۔“

ایک ایسی شخصیت کی طرف سے جو کہ اپنے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو۔

میں نے ایک گھنٹہ ان پر ڈالی۔ اب وہ پھر عوامی ساجب لک رہا ہے۔ سوہ سے۔ گھلا ہے۔

ہم نے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔

جنگلی جنگل کی پہاڑیوں پر کسی پرانے شکار کرنے والے کا پتلا تھا۔ پتلا یہ سرکاری جنگل کے اندر موجود تھا۔

ہے۔ ”مجھے یوں لگا ہے سر ایف لاسلی، ہر سو پہیلا ہوا، درد کا صحرا ہے اور میں تنہا، مجھے

کسی کی محبت، کسی کی قربتیں درکار تھیں۔  
 کسی کی محبت، کسی کی قربتیں درکار تھیں۔  
 کسی کی محبت، کسی کی قربتیں درکار تھیں۔

وہ ہے۔ پہلے تم "عجائبی صاحب سوچے ہوئے" ہو۔ "کس جو لوگ دوسروں کو کہتے ہیں

نہیں دلائے۔ دوسرے بچے جو بچے ہیں۔ یہ خاموش رہ کر ہر  
 جگہ چننا پڑتا ہے کہ میں ہوں، اپنے ہونے کا یقین  
 یہاں کا زمانہ نہیں ہے۔ یہاں کوئی سے اور کسی تکلف میں، ہر قسم

تب (دوسروں) کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ جو جب آج تمہاری سہولت کے لئے

ہوئے۔ ہم اپنی زندگی میں خوش بآس ہو سکیں اور کسی اور کو بھی تم سے شکایت نہ ہو۔ تم نے قرآن مجید کو احسان تک نہ ہونے دیا کہ تم کوئی قرآن پڑھو گے۔ وہ یہ کہ تم کے ساتھ۔

لبہ ہوں  
کی راحت کے لیے چاہی ہو۔ کھارے پھر والوں کو عظمیٰ نہ ہو رکھا کہ تم نے ان کے

۲۔ کسی طرح اپنے ارادوں کا قیام رکھ کر اپنی دنیاوی زندگی کو دھارے لے لی۔

”تسہارا مصوریں۔ مے واسے اچھے سے میں آیا ہوا تیں دیا ہلا۔ یہ بر دا نکلا ہوا میں میں مے  
یہ کہہ کر ادا مہنے کے لے تار مکی مہیں۔“ اس نے ماکو کا سر مچھکلا

”کیونکہ تم نے خاموشی سے فرد جرم لی۔ تمہاری اصل غلطی یہاں تمہاری خاموشی ہے۔“

انہوں نے ان کو دہلی میں رکھا اور انہیں دیکھا اور مسکرا دی۔

”آپ تو ہر نفسیات ہیں سر۔“  
 ”اے اے! میں نے نفسیات کو بھی۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”میرا ذہن واقعی بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ ڈسکس کر کے۔“ اس نے کہا

”میں نے بہت لمبے کہا تھا تم سے کہ کوئی بھی مسئلہ ہو مجھ سے پتہ کر سکتی ہو۔“ وہ  
”میں اب طولیوں کا سراپا“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”بہت در ہو چکی ہے۔“

اک دنیا بھلے رہا

"میں کیوں جلا آئی ہوں۔" اچھٹے ہوئے آہ آہ

اور ایک چھت کے نیچے چٹا سو دروازوں۔ کسی کو علم ہو جائے تو کہتا سوچا، کیا سمجھے۔ اگر کہیں میں کسی۔

ان کی مسکراہٹ نہایت تروتازہ اور جاندار تھی۔ جیسے وہ اسی کے ہوا، جیسے وہ اسی کے

نہیں۔ ہم نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہ اسے اپنے اہل سرخوستان عباسی کے بجائے کوئی دوسرا شخص سمجھ کر لے ہوئے تھے۔

”مراسم کھرچاؤں کی۔“ وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔

”ضرور! میں خود چھوڑ کر آؤں گا۔ لیکن چائے پینے کے بعد۔“

”کمال ہے“ وہ بہم سا سکر ائے۔ ”مجھے تو بہت اچھا کم“

”فیلم نے حریت سے انہیں دیکھا۔“

حیرت ہے۔ میں یہاں بھاری پریشانیوں میں گرنے کے لیے لایا تھا اور اس لمحہ

تخیر کر دینے والا۔

ان کا بھجوا کر لود ہو گیا۔ اس لود نے یہیں۔  
 بنیم کا دل حال میں آئے۔ بچی کی طرح ڈھرنے لگا۔

”صبر“ وہ کا پتی آواز میں بھی کہہ سکی۔

ذہن کا فی لائیک دس! م سے م یہاں تو ایسے مت پکارو۔ "وہ نرمی سے بولے۔" مجھے

نہر! میں جاؤں گی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

جہاں جیسے ٹوٹ سا گیا۔ عہد کی صاحب کی ظلم سے آزاد ہوئے۔

رو: انا ان ساریں۔ انا ان ایستریسی سورس میسم! وہ خود بھی کھڑے ہوئے گئے۔ "مخانیجہ  
ایلیزا مجھے صاف کرے۔"

میں نے جھگڑے کر لی تھی۔

ما بخیر: چائے تو پی لو۔ اور سمندر کا نظارہ کر لو۔“ وہ بوکھلا سے کہنے لگا۔

میں صوفی اداکاروں سے ہونٹ چل رہی تھی۔

نظروں میں گر جاؤں گی۔“

ادباً ساسا ساس - غم کے لمبوں سے آزاد ہوا تھا۔ وہ آہستگی سے دو بارہ صوفیہ / بزم

کڑا: "وہ اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ہو لے۔" اچھا چلو اب چائے پو۔ یہ کہنا لے۔

سنا چائے ہی سوں کی۔ اس نے آہستی سے کہتے ہوئے اپنا کپ اٹھالیا اور دھیرے

ذیل :- ان کے بارے میں :- "اور سورج لکھنؤ، اوجھڑ، ریتہ

١٠٠



5.2

341  
 "میں نے اس کی روشنی میں خدا کے بارگاہ کی خدمت سے ملنے کی کوشش کی۔"   
 "میں نے اس کی روشنی میں خدا کے بارگاہ کی خدمت سے ملنے کی کوشش کی۔"

[illegible]

میں نے یہ جہیز ہمیشہ کے لئے تمہاری دوسری سے اور دوسرے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ خواہ اس

کتابت کی گئی ہے۔

...

پس بعد آج وہ اس طرف الی الی کی۔ دیکھ رہے تھے کہ وہ ان کی خوشحالی کی کیا ہے

میرا بھی، سائنسے بھی، جہاں بانی ہر ارضیا سائنس کے اربعی تھی۔  
 "وہ بیچ کا دروازہ کھول کر وہ اندر دیکھ سکتی تھی۔" کیا حال ہیں۔  
 "میں جہاں تھی۔"

”السلام“۔ ”بیکر السلام۔“ بخدا آئی ہے۔ اسے ازل سے بعد۔  
”اس نے چونک کر سر اٹھایا۔“ ”کہا، کہ ازل سے بعد۔“  
”اس نے اسے اٹھ کر نظر دوڑایا۔“ ”کہا، کہ ازل سے بعد۔“

”میں نے ان سے کہا، تم جڑاؤ لیں

”ہاں کی طبیعت ٹھیک تھی۔ شہر وزیٹا ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں۔“

”اچھا“ وہ ہر مسئلہ پر کہتا تھا۔ ”وہ سوچ رہے تھے۔“

11

”ہاں ہاں وہی ہو گیا۔ آج پھر بیٹا۔ اسی اے ہوں۔ اے۔ ہم چائے بنا کر لائے ہیں۔“ وہ انھیں لے کر باہر نکلا۔

”اگر ہے وہ جانا۔“ وہ آج بڑے سڑ میں تھی۔ سڑاتی ہوئی  
”تکلف کسی۔ اتے دنوں کے بعد جاوے گا آئی ہے۔“

کریکٹ طرف سے ملی ہے۔

”مبارک پر حیرین دیے نہ بار بار بیت نہ اور دس سو چوبیس سال۔  
ایک کا خصوصاً باران وہ اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔

میرزاں سائیں میں رکھ کر وہ کھڑی ہوئی۔

دروازہ ایب سے لے کر حیران ہوا پھر سکرادیا۔

”کسی منہ! کسی ہیں آپ؟“ اس کا چہرہ اچھک رہا تھا۔

”میں ٹھک ہوں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”میں سوچتا ہوں کہ سب سے پہلے کس سے سنا ہوگا۔ حیرت انگیز طور پر۔“

”خائنوں کو کر سکرادیا۔ آج وہ اتنا خوش نظر آ رہا تھا کہ جی اے اے میں اس سے پہلے دیکھا تھا۔“

"سمندر، نکل دیجھو کی" وہ سہرا لے۔  
 "نکل ضرور تہ نکل رہی۔" وہ شہر دی۔

”میں نے اب کمر بنالیا۔“ دینہ بچی

سکتے نہیں رہی ہر کسی کے ہاتھ پر سے جتے، بچے کی۔ اے ہاں! ایک صد ہونی ہے کسی بھی بات کی۔ "انھوں نے کہا سب سے پہلے۔"

من نے یہ سب

[illegible]

ہیں۔ میں صدا کی بھڑکی جادو۔ پتے پتے رزوں۔ بخوردنی کی سرسیر ہوں۔ مجھ سے تو ایک بار بڑا  
انہیں ہوا چاہتا۔ تم لوگوں کو اس کی کوئی خبر ہی نہیں۔ اس جابے بہتیم جس تو بھڑکی تھی اسے اس کا نام

تو نہ یہاں نہ وہاں نہ تیں رہی ہے وہی جیسے مردوں کا۔ مے م اسی مذہب سے قوت پاتے ہیں۔  
وہ روایتیں وہ اپنی ماں کے گھر کھا کر بھی لے گئی۔ ”وہ وہ اپنی بھری بیٹی تھیں۔ پھر مکی کے گھر گئے۔“

۳- ”کیوں؟“ چلے وہ اپنی ماں کے کمرے کی طرف جاتی تھی آپ کو؟“ وہ پوچھا۔ ۲۳- ۱۵ اکتوبر

پہلی خوشی اور اپنی مرضی سے اب رہیں اے۔۔۔ دیکھیں اس کا کام۔ آپ کو بھی تو کوئی قصہ ملتا ہے کہ وہ کون سی ہے۔ کون سا قصہ۔۔۔

”اے لڑکا! عجیب کہا۔ میاں منہ سفیال کر بات کرو۔ تمہاری رضا میں لائی تھی اسے اب جوہر ہے۔“

”میر کی رضا“ انہوں نے دانت چکچکے۔ ”امی امی آپ بہت بہتر طریقے سے جانتی ہیں کہ کہہ کر

”ہاں ہاں، سب جانتی ہوں۔ کس طرح سب کے سامنے اس نے قہقہہ تھا تو آخر۔۔۔ کسے انکسار کیا۔“

پھر تم نے اپنی مرضی سے شاہی کی ہانپی بھری دی۔ میرے حافظے کو ابھی رنگ نہیں چڑھا۔  
”مجھے بھی یاد ہے،“ کہ آج نے مجھے گھبراہٹ۔ مجبور کیا تھا مجھے۔“

”ہاں جیسا! عالم بے ہوئی میں سہرا باندھ کر لے گئے تھے تمہیں۔ سب کچھ میں نے اور آزمائے گی“

”نہی تم دروں سے علی پوچھا۔ ماں ہوں مہارے، دودھ پینی پنی تیں مجھے طے مت دیا کر۔“

مختص ہے ہو کر شرت کا بن کھولنے کے۔

تو "انہوں نے اچھے سے انہیں دیکھا۔  
وہ دریں دریں میں سے دیکھتا چلا ہو۔

”خدا! ان کے جوابوں پر ہم گرا۔“ سال ہوش میں تو ہو؟ ارے وہ وہاں خلیفہ بنے، خدا عالم ہیں۔ ہم کو آزاد کیے دیتا ہوں۔ اب ہم کو لے آئیں۔“

”دن کے میں یہ حقوق پڑا ہے سو پڑا ہے۔“



”شاید آپ یقین نہ کریں۔ میری خواہش تھی سب سے پہلے۔ یہ خبر۔“ وہ جھجک کر چند لمحوں کے لیے لگا۔  
 ”کوئی خوشی کی بات ہے؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔  
 ”بہت بڑی خوشی ملی ہے مجھے۔ میں نے ایگزٹنگ کلیر کر لیا ہے۔“ اس کا سانس بے ترتیب ہو گیا۔  
 ”P.C.S. کا؟“ صبا کھل اٹھی۔  
 اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اوہ۔ مبارک ہو بہت بہت۔“ اسے واقعی بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔ ”آپ کو آپ کی محنت کا ثمر مل گیا۔“  
 ”تھینک یو۔“ وہ خوشی سے ہنس پڑا۔

صبا اسے دیکھتی رہ گئی۔ یوں بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے وہ کس قدر اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرے رنگ کتنے بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ ہنسی اس پر کیسی سج رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔  
 اسی لمحے دروازہ کھول کر عفت خانم اور شہروز اندر آئے تھے۔

”امی۔ امی۔ میرا رزلٹ آ گیا۔ میں نے ایگزٹنگ کلیر کر لیا ہے۔“ وہ بے اختیار ان کی جانب بڑھ گیا۔  
 ”شکر ہے میرے مولا کا۔“ عفت خانم نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔  
 ”یا ہو۔“ شہروز نے نعرہ لگایا۔ ”فیروز بھائی زندہ باد۔“

وہ ماں سے الگ ہو کر بھائی سے لپٹ گیا۔  
 صبا مسکراتے ہوئے ان سب کی خوشیوں کے رنگ دیکھتی رہی۔ اس لمحے پھر اس کا من بے ایمان ہونے لگا تھا۔ اس ماحول کا ایک حصہ ہونے کی خواہش پھر اس کے اندر جوار بھائے کی مانند اٹھنے لگی تھی۔  
 پھر بڑی آہستگی سے ان سب کے درمیان سے نکل کر وہ گھر چلی آئی تھی۔



خفگی سے تپا ہوا چہرہ لیے وہ قدرے رخ موڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ رضا مراد اس کے قدموں میں بیٹھا آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔

”رضا!“ الماس نے اس کی بات کاٹی۔ ”اب یہ میری انا کا مسئلہ ہے۔ میرے وقار کا معاملہ ہے۔ میں یہ طے کر چکی ہوں کہ میں دلاور خان کا ایک پیسہ نہ لوں گی۔“

”ڈونٹ بی سلی الماس!“ اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ”تم عثمان خان کے پھیلانے والے جال کی بنت پر غور کرو۔ اس میں پھنسو مت۔ وہ شخص یہی کچھ چاہتا ہے کہ تم اگر اس سے نسبت توڑ کر کہیں اور اتر سکو ہو تو اب اس کے باپ کے مال میں سے ایک پیسہ بھی نہ لے جا سکو۔ اسی لیے اس نے یہ جال بڑی خوبصورتی سے پھیلا دیا ہے۔ خواہ مخواہ جذباتیت پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے جس کا شکار تمہاری والدہ تک ہو گئی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اس کا پلان میں اس کے منہ پر ماروں گی۔ وہ تمہیں لالچی ثابت کرنا چاہ رہا ہے۔ تو تم اسے بتا دو کہ تم کتنے آنٹ ہو۔ اس طرح میں بھی اپنی ماں اور چچا کی نظر میں سرخرو ہو جاؤں گی۔ دیکھو رضا۔ حالات سے اتنے خوفزدہ مت ہو۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔ میں بنوں گی تمہارا سہارا۔“

”نہیں چاہیے مجھے ایسا کمزور سہارا الماس!“ وہ جھنجھلا کر پرے ہو گئے۔ ”نہیں چاہیے مجھے ایسا کمزور سہارا کہ ایک طویل عرصے تک میں یونہی جوتیاں پہناتا رہوں۔ میں کچھ بنا چاہتا ہوں۔ کسی مقام پر پہنچنا چاہتا ہوں۔ ایک ہی جست میں۔ تم میری بات سمجھو۔ مجھے موٹیویٹ کرنے کی کوشش مت کرو۔“

”کیا میں یہ سمجھوں کہ ہر طرح کی دشمنی کے باوجود عثمان خان کا تمہارے میں کیا گیا تجربہ درست ہے؟“ وہ بھڑک اٹھی۔



”پاگل ہوں۔ بے وقوف۔ جاہل۔“  
 ”رضا! بدتمیزی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“ وہ بھنا گئی۔  
 ”ہاں۔ لیکن بے قوفی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔“ وہ غصے میں کھڑا ہو گیا۔ ”خالی ہاتھ آنا چاہتی ہو۔“  
 ”ہاں۔ رہ لوں گی۔ وہ قطعیت سے بولی۔  
 ”لیکن میں نہیں رہوں گا۔ یہ مت سمجھو کہ میں صرف تمہارے حسن پر مر رہا تھا۔“ وہ غصے میں کہہ رہے تھے۔

”رضا!“ وہ اس کا منہ تک رہی تھی۔ ”کہو۔ کیا کہہ رہے تھے۔“  
 ”دیکھو الماس۔ مجھے کچھ بننے کے لیے تمہاری مدد درکار ہے۔“ وہ نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ”اپنے گھر والوں کو میرے حق میں راغب کرو۔ الٹا مجھے بڑکانے کی کوشش چھوڑ دو۔ چھوڑ یہ انا اور وقار کا جھگڑا۔ انا دنا کچھ نہیں ہوتی۔ انسان کی راحت اور سکون سب سے بڑی نعمت ہے۔ چاہے اس کے لیے کسی کے آگے جھکنا ہی کیوں نہ پڑے۔“  
 ”وہ چند لمحے اس کے الفاظ پر غور کرتی رہی۔ پھر اس نے اٹھ کر سینڈل پہنے، پرس اٹھایا اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔  
 ”مجھے افسوس ہو رہا ہے رضا!“ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رُک گئی۔ ”عثمان خان کے مقابلے میں یہ بازی ہار گئی ہوں۔ آئی ایڈمٹ۔“  
 برف کی طرح سرد لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ باہر نکل گئی تھی۔

ایک عجب اضطراب کی کیفیت میں وہ صحن میں ٹہل رہی تھی۔  
 ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ لیوں کو بار بار کاٹتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ وہ کیا بننے جا رہی تھی۔ لیکن ہر بار جواب میں انتقام کے دہکتے جذبے کی منہ زور لہریں اس کے خیالات پر بادل بن کر چھا جاتی تھیں۔

”ہاں۔ ٹھیک ہے۔ یہی ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جو، جو طوفان بن کر اٹھے اور لمبا میٹ کروے ہر شے کو۔ تمہیں نہیں کر کے رکھ دے ہر کسی کی ہستی۔ کیا سمجھا تھا مجھے ان لوگوں نے۔ ماں، بہن اور بیٹے نے۔ کوئی پتھر کا گرا تھی۔ میں رومی کاغذ تھی جس پر یہ ظلم کیا ہے انہوں نے۔ میں انہیں بتاؤں گی کہ ظلم کیا ہوتا ہے۔ کیسے مظلم کے دل کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔ لہو آنکھوں سے رے تو کیا محسوس ہوتا ہے۔“  
 ”دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ بیچ صحن میں رُک گئی۔

”کون؟“ اس نے وہیں سے پوچھا۔

”ریاض!“ جواب حسب منشا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

”آگے آپ!“ پرسکون لہجے میں کہتے ہوئے وہ پلٹ رہی تھی۔

”خیریت تو ہے ناں! تم نے آفس فون کیا تھا!“ وہ حیران تھے۔

”جی ہاں۔ میں نے ہی کیا تھا پڑوس سے فون۔“ وہ دیر سے مسکرائی۔

”کیوں۔ خیریت! امی کہاں ہیں؟“ وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔



”جی جان تو صبح سے آپ کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ یوسف اور یونس بھائی آپس کے ہیں۔ اس لئے اکیلی ہوں۔“

”تو اس لیے بلایا ہے۔“ وہ بات سمجھ کر کھل کر مسکرا دیے۔

”کس لیے؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

”کپ شپ کے لیے۔“ وہ جھینپ کر ہنسنے لگے۔

”جی نہیں! مجھے تو آپ کے ساتھ آپ کے گھر جانا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”یوسف اور یونس بھائی تو درمیان میں آئیں گے۔ میں نے آپ کو بلایا۔ آپ کیا سمجھے؟“

”شریر!“ وہ شرمندگی سے بولے۔

”آپ بیٹھیں۔ میں ذرا لباس تبدیل کر لوں۔“

انہیں نیچے بٹھا کر وہ اوپر چلی آئی۔ الماری کھول کر کپڑوں پر نظر دوڑانے لگی۔

”شبوا!“

”وہ اس کے عین پیچھے بولے تھے۔ وہ چونک کر مڑی۔“

”اوہ! صبر نہ ہوا آپ سے۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”تمہیں دیکھ کر جو صبر سے کام لے، سمجھو اس کے سینے میں دل ہی نہیں۔“ وہ ہنس رہے تھے۔

”جانتے ہیں کیا رشتہ بنتا ہے۔ آپ کا مجھ سے؟“ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھنے لگی۔

”محبت کا۔ پیار کا۔“ وہ اس پر جھکنے لگے۔

”پاگل ہو گئے ہیں آپ۔“ اس نے جھنجھلا کر انہیں پیچھے دھکیلا۔

”کیا ہو رہا ہے یہ؟“

”ایک سرد آواز ابھری تھی۔ وہ دونوں ہی چونک اٹھے کمرے کے دروازے پر یوسف کھڑے تھے۔“



چند لمحوں کے لیے کمرے میں مکمل خاموشی چھائی رہی، پھر بالآخر شبنم نے خشک لہجے میں کہا۔

”کچھ بھی نہیں! یہ ریاض بھائی کب سے اپنے گھر چلنے کی ضد کر رہے ہیں اور میں جانا نہیں چاہ رہی۔“

”کہتے ہیں، جی جان بلا رہی ہیں۔“

اس نے ایک مطمئن نگاہ ریاض بھائی پر ڈالی جو ”کاٹو تو لہو نہیں“ کی مکمل تصویر بنے جلد دساک

کھڑے تھے۔ چہرے پر اس قدر ہولناکی تھی کہ اسے ہنسی آنے لگی۔

کہاں تو ابھی شوخی و شرارت ان کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور کہاں وہ صورت ہوئی تھی کہ

لگتا تھا ابھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں گے۔

یوسف نے پھر ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی۔ نظروں میں بے تحاشا الجھن بھری ہوئی تھی۔ جیسے

لمحوں قبل جو منظر یک بیک تبدیل ہوا تھا۔ اسے واپس..... ذہن میں لانا چاہ رہے ہوں کہیں کچھ غلط ہوئے؟

احساس پھانس کی طرح ان کے دماغ میں چبھ رہا تھا۔

”آپ لوگ نیچے آ جائیں۔ میں کھانا رکھتی ہوں۔“

وہ بھرپور اطمینان کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس کے انگ انگ سے خوشی اور سرشاری

کی لہریں پھوٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ دل اوپر ہی اوپر فضاؤں میں تیر رہا تھا۔ یوسف کی نگاہوں کی بے اعتدالی

اور الجھن اسے بے پایاں مسرت کے احساس سے دو چار کر گئی تھی۔ اس کا جی تھمہ لگانے کو چاہ رہا تھا۔